# اِسلام اور بدلتی دُنیا

# اِسلام اور بدلتی دُنیا

ضیاء الحسن فاروقی

ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز
جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر۔ نئی دلی ۱۱۰۰۲۵

# فہرست مضامین

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اُردو بازار، دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ 202001

پہلی بار جولائی ۱۹۸۴ء تعداد 600 قیمت =/21

برٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دلی ۲ میں طبع ہوئی۔

# ابتدائیہ

پانچ برس ہونے کو آئے ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم کے انتقال کے بعد 'اسلام اینڈ دی موڈرن ایج' (سہ ماہی انگریزی) اور 'اسلام اور عصر جدید' (سہ ماہی اُردو) کی ادارت کی ذمّے داری مجھے سونپی گئی اور میں نے جلد بازی میں یہ بارِ امانت اُٹھالیا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اِس ذمّے داری کو اب تک خوش اسلوبی سے نبھایا ہے اور اِس کا اعتراف اُن لوگوں نے بھی کیا ہے جو عام طور پر کسی کے کام کو پسند کرنے میں جلدی نہیں کرتے۔

'اسلام اور عصر جدید' کا مقصد یہ رہا ہے کہ مسلمانوں کی توجہ اِس عہد کے اُن اہم ترین فکری، علمی، معاشی، سماجی اور اخلاقی مسائل کی طرف مبذول کرائی جائے جن سے خود ان کی زندگیاں متاثر ہیں اور انھیں یہ بتایا جائے کہ یہ مسئلے کتنے ہی پیچیدہ کیوں نہ ہوں، اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عقل و تدبّر سے کام لے کر حل کیے جا سکتے ہیں۔

اس علمی مجلّے میں جو اداریے میرے قلم سے نکلے ہیں، انھیں اگر غور سے دیکھیے تو چند بنیادی نکات ہیں جو تقریباً سب میں مشترک ہیں، مسلمانو

# مرحوم عابد صاحبؒ

(۱۸۹۶ - ۱۹۷۸)

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لے ساقی

پرانے لوگ اُٹھتے جاتے ہیں اور ان کی جگہ لینے والے پیدا نہیں ہوتے۔ صورتِ حال اگر ہمارے ساتھ یہی رہی تو نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارا کیا حال ہوگا۔ عابد صاحب ہمارے بزرگ تھے۔ ایسے بزرگ کہ وہ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہم زندگی کی دھوپ میں تنہا کھڑے ہیں اور کوئی شجر سایہ دار نہیں جس کی چھاؤں میں پناہ لیں۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کو بنانے اور باوجود اس کے کہ جامعہ چھوٹی تھی، اسے اعلیٰ معیار کی درسگاہوں کا مرتبہ دینے میں عابد صاحب کی علمی کاوشوں کا بہت زیادہ دخل تھا۔ ان کی تصنیفات و تالیفات، ان کے ترجموں اور ان کے قلم سے نکلے مقالوں اور مضمونوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ماہنامہ جامعہ (جامعہ ملیہ اسلامیہ کا علمی و ادبی رسالہ) کے وہ عرصے تک ایڈیٹر رہے۔ اس میں وہ جو کچھ لکھتے اُسے ملک کے علمی حلقوں میں بڑی قدر و منزلت سے دیکھا اور پڑھا جاتا۔ جامعہ میں جو

کے عصری مسائل سے متعلق ہیں اور اُن اخلاقی، معاشی اور معاشرتی اقدار کے ترجمان ہیں جن کا سرچشمہ اسلامی تعلیمات ہیں۔ خیال آیا کہ ان اداریوں کو اپنے قارئین کی آسانی کے لیے ایک جگہ الگ سے کیوں نہ شائع کردیا جائے، مزید برآں اس سے یہ فائدہ بھی ہوگا کہ ان اداریوں سے وہ لوگ بھی استفادہ کرسکیں گے جنھیں طویل علمی مضامین کو مع شروح و حواشی کے پڑھنے کی فرصت نہیں، چنانچہ اب تک کے اپنے اداریوں کا یہ مجموعہ پیش کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ یہ محنت رایگاں نہ جائے گی، لوگ ان اداریوں کو تسلسل سے پڑھیں گے، ان میں جو پیغام ہے اور خفی یا جلی جو نکات ہیں ان پر غور کریں گے اور "بہ اندازۂ ہمت" آگے بڑھ کر "گوئے توفیق سعادت" کو اٹھا لینے کا حوصلہ کریں گے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے جنرل منیجر جناب شاہد علی خاں کا ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کام میں میری بڑی مدد کی ہے۔

ضیاء الحسن فاروقی

۱۸ جولائی ۱۹۸۴ء

تھے کہ یہی تو وقت ہے کچھ کرنے کا، اس کی ایک مثال ہفت روزہ "نئی روشنی" تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب فرقہ وارانہ کشیدگی بہت بڑھ گئی اور ہندوستان کے بعض علاقوں میں مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت دشوار ہوگئی، تو عابد صاحب نے محسوس کیا کہ فرقہ پرستی کی اس آگ کی لپیٹ میں صرف مسلمان ہی نہیں ہیں بلکہ پورا ملک اور وہ تمام انسانی اقدار ہیں جنھیں اس سرزمین پر تاباں و درخشاں دیکھنے کے لیے ہم نے آزادی کی لڑائی لڑی تھی۔ انھوں نے اس طوفان میں مسلمانوں کے پیر اکھڑتے ہوئے اور انسانیت کے پرچم کو سرنگوں ہوتے ہوئے دیکھا، اور پھر اپنے درد و اضطراب کو "نئی روشنی" کی شکل میں ظاہر کیا۔ تقسیم ہند کے فوراً بعد کے گھپ اندھیرے میں اس اخبار کا اجرا، واقعی روشنی کا مینارہ ثابت ہوا، عابد صاحب نے اس کے ذریعے گم کردہ راہ انسانوں کی رہبری کی، ان کے سامنے صحیح صحیح منزل کی نشاندہی کی اور بتایا کہ اس منزل تک پہنچنے کی سیدھی راہ کون سی ہے۔ وہ بہت سے لوگ جن کے قدم ڈگمگا گئے تھے، اپنی جگہ جم گئے، وہ جو مایوسی و انتشار کا شکار تھے اپنے اندر مستقبل کی طرف بڑھنے کی ہمت پانے لگے اور کتنے ہی "نئی روشنی" کے پڑھنے والوں نے محسوس کیا کہ تخریب کی راہوں ہی میں جلد ہی تعمیر کی کرنیں بکھر جانے والی ہیں۔

عابد صاحب مسلمانوں کے ذہنی جمود و افسردگی اور ان کے شدید احساس کمتری کی طرف سے بہت متفکر اور مضطرب رہتے تھے۔ مجھے اکثر وہ اپنی اس فکرمندی اور اضطراب میں شریک کرلیا کرتے اور کہتے کہ جس ملت کے پاس اسلام کی شکل میں خدا کا وہ عالمگیر پیغام موجود ہے جس نے تاریخ کے اس عہد میں جب مغرب میں ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا، ایک عظیم الشان تہذیب کی بنا ڈالی تھی، وہ کیوں آج اپنے آپ کو اس طرح بے چارہ، کم تر اور مجبور سمجھتی ہے، ایک زمانہ وہ تھا کہ مسلمان اقدام کر کے نئے حالات کا سامنا کرتے تھے اور خُذ مَا صَفا دَعْ مَا کَدِر کے اصول پر عمل پیرا ہوکر دنیا کے تہذیبی خزانے میں نئی نئی چیزوں کے اضافے کرتے جاتے تھے۔ اور آج

اُردو اکادمی قائم ہوئی تھی اس کے روحِ رواں عابد صاحب ہی تھے۔ ان کی سربراہی میں ملک و بیرونِ ملک کی بڑی قد آور شخصیتوں نے اکادمی کے زیرِ اہتمام لکچر دیے اور تھوڑے ہی عرصے میں اس کا علمی وقار مستحکم ہوگیا۔ اسی طرح مکتبہ جامعہ نے اُردو زبان و ادب کی جو خدمت کی ہے اس میں عابد صاحب کے ادبی ذوق اور علمی ژرف بینی کا بڑا حصہ ہے۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے ساتھ انجمن ترقی اُردو کی معرکتہ الآرا انگریزی۔ اُردو ڈکشنری مرتب کر کے انھوں نے اُردو زبان کی مہتم بالشان خدمت انجام دی۔ اُن کی بعض کتابوں اور ترجموں نے کلاسیکی حیثیت اختیار کرلی ہے اور ان کے فکر و دانش کی ہمہ جہتی ہمیں اُن عالموں کی یاد دلاتی ہے جن کا علم کسی شعبۂ علم میں تخصص کے باعث محدود ہوکر نہیں رہ جاتا تھا۔ وہ صاحبِ طرز ادیب تھے لیکن ادب کے دائرے سے باہر بھی ان کے فکر کی جولانگاہیں تھیں۔ ان کے دل میں ملک و ملت کا درد کچھ اس طرح جاگزیں ہوگیا تھا کہ اپنی عمر کے آخری لمحات تک وہ اس کی چبھن محسوس کرتے رہے۔ وہ اس بات میں حق بجانب تھے اور اس بات کو بار بار اپنی تقریر اور تحریر میں دُہراتے رہتے کہ ملک و ملت کی سچی خدمت یہ ہے کہ نوجوانوں کی ذہنی و اخلاقی تربیت اس نہج پر کی جائے کہ ان میں خود اعتمادی اور خودداری پیدا ہو اور وہ اُن اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حامی اور مبلّغ بن جائیں جنھیں حکمار نے حق، صداقت، حُسن اور عدل سے تعبیر کیا ہے اور جنھیں انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسّلام نے "خیرِ کثیر" کہا ہے۔ مسلمانوں کے حالات سے وہ مطمئن نہ تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں ایسے افراد کی تعداد بڑھتی رہنی چاہیے جو طرزِ کہن کے ساتھ آئینِ نو کی روح کو بھی سمجھیں اور 'قدیم' اور 'جدید' کا ایسا خوش گوار امتزاج پیش کریں کہ عصرِ حاضر کے فکری، علمی، سماجی اور اجتماعی تقاضے مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں روڑا بننے کے بجائے ان کی فلاح و ترقی کے لیے سہارا بن جائیں۔ مسلمانوں پر کوئی مصیبت ٹوٹتی یا ناسازگار حالات میں انھیں مضطرب، ہراساں اور شکست خوردہ پاتے تو عابد صاحب بے چین ہو جاتے، لیکن وہ اپنے قلب کی بے چینی پر صابر و شاکر ہوکر بیٹھ جانے والوں میں نہ تھے۔ وہ کہتے

گھٹتے جا رہے ہیں، ان کے کیا اسباب ہیں اور دوسری طرف اسلام کی تعلیمات کا اس نظر سے گہرا اور معروضی مطالعہ کریں کہ وہ ان امراض کی روک تھام اور علاج کے لیے کیا تدبیریں بتاتا ہے۔"

مرحوم کی ایک عرصے سے آرزو تھی کہ وہ اپنے ان خیالات کو ساری دنیا میں اور خاص طور سے مسلمانوں میں عام کر دیں، لیکن افسوس کہ ان کی یہ آرزو پوری ہوئی تو کب، جب کہ اُن کا آفتابِ زیست لب بام آچکا تھا، کاش حالات نے اجازت دی ہوتی اور وہ "اسلام اینڈ دی موڈرن ایج سوسائٹی" کو ۱۹۶۹ء کے بجائے ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء میں قائم اور اس کی طرف سے دونوں رسالے "اسلام اور عصر جدید" اور "اسلام اینڈ دی موڈرن ایج" نکال سکتے۔ ۱۹۶۹ء میں بھی اپنے اس مقصد کے لیے اُنھیں کتنے پاپڑ بیلنے پڑے، اس کا مجھے علم ہے کیوں کہ میں بھی آغاز کار ہی سے اُن کے خیالات و عزائم میں شریک تھا، کئی مرحلے ایسے آئے کہ ہم لوگ امید چھوڑ بیٹھے کہ شاید ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا، لیکن عابد صاحب مایوس ہو جانے والوں میں سے نہ تھے، وہ جب کسی کام کا تہیہ کر لیتے تھے تو اسے تکمیل کی منزل تک پہنچا ہی کے چھوڑتے تھے، آخر کار وہ کامیاب ہوئے، سوسائٹی بھی قائم ہوئی اور رسالے بھی نکلے، لیکن اب اُن کی صحت بہت گر چکی تھی، پھر بھی یہ ان کی ہمت و استقامت اور پیری میں جوانوں کا سا حوصلہ اور جدوجہد کا کرشمہ تھا کہ تھوڑے ہی عرصے میں ملک و بیرون ملک کی علمی دنیا میں سوسائٹی اور اس کے دونوں رسالوں نے ممتاز حیثیت حاصل کر لی۔ ان کے اندر جب تک سکت رہی، وہ انھیں مالی اعتبار سے مستحکم اور علمی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ معتبر بنانے کی کوشش کرتے رہے آخر ش ۱۳ دسمبر ۱۹۷۸ء کی صبح کو وقتِ موعود آپہنچا اور وہ اپنے پیدا کرنے والے سے جا ملے، اور اب ہمارے لیے وہ حق و صداقت کی راہ میں مرمٹنے کی روشن مثال چھوڑ گئے ہیں، علم و دانش کے وہ چراغ جلا گئے ہیں جن کی لَویں ہمیں ہر لمحہ اپنی طرف بلاتی رہتی ہیں، ذوقِ عمل اور جہدِ مسلسل کا پیغام ہمیں ان کے ہر نقش کفِ پا سے ملتا ہے

یہ صورت ہے کہ وہ ہر نئی چیز سے ڈرتے ہیں، اپنے آپ سے ڈرتے ہیں، یہاں تک کہ خود زندگی سے ڈرتے ہیں۔

عابد صاحب ہندوستانی تہذیب و تمدّن کے صاحب نظر عالم ہونے کے ساتھ ہی عالمی تہذیب کے بھی اسکالر تھے اور اس بات کا گہرا شعور رکھتے تھے کہ آج کی عالمی تہذیب جس کا دوسرا نام مغربی تہذیب ہے اور جو نوعِ انسانی کے سارے ورثے پر قابض ہے، ایک شدید بحران میں مبتلا ہے۔ "اس کے ایک حصّے میں تو حد سے زیادہ انفرادی آزادی نے سماجی اور معاشی عدم مساوات اور روحانی و اخلاقی تشکیک اور بے یقینی پیدا کردی ہے، اور دوسرے حصّے میں حد سے زیادہ اجتماعی جبر اور اسی کے ساتھ ابدی روحانی و اخلاقی اقدار کے انکار نے فرد کو بے روح، بے ارادہ اور بے حس مشین بنادیا ہے اور دونوں حصّوں میں صنعتی نظام نے مادی زندگی کے روز افزوں تقاضوں کو ہوا دے کر انسان کے سکونِ قلب کو غارت کردیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ دن دونی رات چوگنی بڑھنے والی صنعتی پیداوار کے لیے بازاروں کی تلاش نے قوموں میں باہم سخت رقابت پیدا کردی ہے اور سائنس کے ناجائز استعمال سے ہولناک ہتھیاروں کی ایجاد نے سارے عالمِ انسانیت کے چشم زدن میں تہس نہس ہوجانے کا شدید خطرہ پیدا کردیا ہے۔ ... مغرب میں بہت سے اہلِ نظر اور اہلِ دل ان بھیانک خطروں کو محسوس کرکے ایسے تصوّرِ زندگی کی جستجو میں ہیں جو انفرادیت اور اجتماعیت، مادی اور روحانی اقدار میں ہم آہنگی کی راہ دکھا سکے ... دنیا کے مختلف مذاہب اور تہذیبیں اہلِ مغرب کی آج کی مشکلوں کو جو کل خود ان کو بھی پیش آنے والی ہیں، حل کرنے میں سر کھپا رہی ہیں، مسلمانوں کا جو اپنے آپ کو خدا کے عالمگیر پیغام کا مبلغ کہتے ہیں، خاص طور پر یہ فرض ہے کہ وہ اس مہم میں اپنا رول ادا کریں اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے کہ وہ ایک طرف مغربی تہذیب کا جو عصرِ حاضر کی نمایندہ ہے گہرا مطالعہ کرکے یہ معلوم کریں کہ جو روگ اسے لگ گئے ہیں اور رفتہ رفتہ سارے عالمِ انسانیت کو

تشکیک اور انکار کے اس طوفان کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو دنیا میں اٹھتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

۵۔ اسلامی معاشروں میں تجدد کی تحریکوں کا تنقیدی مطالعہ۔

۶۔ اسلامی معاشروں کی علمی، تعلیمی اور تہذیبی رفتار ترقی کا جائزہ۔

۷۔ ہندوستانی مسلمانوں کے معاشرتی، تہذیبی، معاشی، علمی اور تعلیمی مسائل کا جائزہ اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان مسائل کے حل سے متعلق معقول تجاویز اور مناسب طریقۂ کار۔

۸۔ اسلام سے متعلق مطبوعات پر تبصرہ۔

اس رسالے کے قارئین سے یہ التجا ہے کہ وہ اس کے مضامین کو جذباتیت سے عاری ہو کر گہری اور بے لاگ نظر سے پڑھیں۔ اختلاف رائے کی ہر جگہ گنجائش ہونی چاہیے لیکن ہماری یہ کوشش ہوگی کہ صرف وہی مضامین شائع ہوں جو ذمہ داری، تحقیق، سنجیدگی اور خلوص و نیک نیتی سے لکھے گئے ہوں۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس رسالے کے معیار کو قائم رکھنے کی صلاحیت دے اور اپنی بساط کے مطابق اسلام کی، مسلمانوں کی، ملک و قوم کی، دنیا کی، علم کی اور حق و صداقت کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

جنوری ۱۹۶۹ء

اور اُن کی یادوں کی دنیا سے ہر لحظہ یہ آواز آتی ہے کہ قومی و ملّی کاموں کی راہ میں خواہ کتنی ہی اور کیسی ہی مشکلات کا سامنا ہو، رحمتِ خداوندی سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

اس لیے انھیں یادوں کے سہارے، خدا کی رحمت پر بھروسہ کرکے، شیخ الجامعہ جناب انور جمال قدوائی کے ایما اور حوصلہ افزائی پر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ "اسلام اینڈ دی موڈرن ایج سوسائٹی" کے دونوں رسالوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری رکھے گا۔ ان رسالوں کے موضوعات بحث وہی ہوں گے جو اب تک رہے ہیں۔ البتہ ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ہندی مسلمانوں کے معاشرتی، تہذیبی، معاشی، علمی اور تعلیمی مسائل پر خاص توجہ دیں اور اربابِ فکر نظر کو ان مسائل پر مناظری نہیں بلکہ معروضی انداز سے اپنے خیالات کو پیش کرنے کی دعوت دیں۔ اس طرح رسالے کے موضوعات بحث حسب ذیل ہوں گے۔

۱۔ عصر حاضر کی مغربی تہذیب کے مختلف پہلوؤں کا تنقیدی مطالعہ اور ان عناصر کی نشان دہی جو اسلام کی روحانی اور اخلاقی تعلیم سے ہم آہنگ ہیں اور مسلمانوں کی جائز ذہنی اور مادّی ترقی میں مدد دے سکتے ہیں، خصوصاً سائنس کے دائرۂ فکر کا تعین اور سائنسی اندازِ نظر کی تشریح اور سائنس کی رفتار ترقی کا جائزہ۔

۲۔ اسلامی تعلیم اور اسلامی تہذیب کے ان پہلوؤں پر بحث جو مسلمانوں کے، ہندوستان کے اور دنیا کے اہم ترین مسائل حاضرہ کے حل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

۳۔ مسلمانوں کے ان کارناموں کا ذکر جنھوں نے انسانیت کے علمی اور تہذیبی سرمایے میں اضافہ کیا۔

۴۔ ان مسائل پر بحث کہ اسلام اور دنیا کے دوسرے بڑے مذاہب کس طرح اور کس حد تک مل کر روحانی اور اخلاقی اقدار کے معاملے میں

# اسلامی بیداری

اس وقت دنیائے اسلام کے بعض ملکوں میں "اسلامی بیداری" کے آثار کچھ اس طرح ظاہر ہوئے ہیں کہ ایک بار پھر یہ بحث اٹھ کھڑی ہوئی ہے کہ کیا اسلام میں اس سماجی، معاشی اور سیاسی بحران کا علاج ہے جس سے دنیا دوچار ہے؟ اور کیا مسلم معاشرے جو خود ابھی اپنی جگہ اخلاقی پستی، سماجی پسماندگی، معاشی ژولیدگی اور سیاسی پراگندگی کا شکار ہیں، اپنی اصلاح کرکے اور قرآنی تعلیمات کے مطابق اپنے آپ کو مستحکم کرکے بحران و انتشار کی ماری دنیا کی رہنمائی کرسکتے ہیں؟ پاکستان اور ایران میں اسلامی نظام کے قیام کے بار بار اعلان کی وجہ سے خاص طور پر یہ سوالات کیے جارہے ہیں، یورپ و امریکہ کے اخبارات و ماہنامے ان سوالات سے بڑی دلچسپی لے رہے ہیں اور بعض سیاسی حلقے یہ پروپیگنڈا کرکے کہ اسلام آگے بڑھ رہا ہے عیسائی دنیا کو خوفزدہ بھی کررہے ہیں۔ خود ہمارے اپنے ملک میں بعض صحافیوں اور اہلِ قلم نے اس سلسلے میں اپنی فکرمندی اور نوع بہ نوع اندیشوں کا اظہار کیا ہے۔ غیر مسلمانوں میں جو صاحبِ نظر ہیں اور جنھیں مسلم ممالک میں مذہبی اور اصلاحی تحریکوں کے نشیب و فراز سے واقفیت ہے، وہ بھی "اسلامی بیداری" کی اس لہر کو بہ نظرِ غور دیکھ رہے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ عام طور پر لوگ اپنے اپنے زاویۂ نگاہ سے معاملات و مسائل کو دیکھتے ہیں اور ایک رائے قائم کرلیتے ہیں، کم لوگ ہیں جو "اشیاء" کو اسی طرح دیکھیں جیسی کہ وہ ہیں۔ ہمارا خیال

ہے۔ لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد ان ملکوں میں جو مسائل پیدا ہوئے وہ پہلے کے مسائل کے مقابلے میں کہیں زیادہ پیچیدہ تھے۔ سیاسی اعتبار سے ان ملکوں میں یہ تبدیلی آئی کہ زمام اقتدار ان کے اپنے ہاتھوں میں آگئی اور اسی کے ساتھ وہ تمام ذمہ داریاں بھی آگئیں جو آزاد اور ساورن ملکوں کی ہوتی ہیں اور یہ بھاری بوجھ انھیں افراد کو اٹھانا تھا جو اپنے ملک کی سیاسی، مذہبی اور اصلاحی تحریکوں سے وابستہ تھے۔ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ہمیشہ ایسی صورت حال میں سب سے زیادہ نقصان اُن کاموں اور پروگراموں کو پہنچتا ہے جو مذہبی و اصلاحی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ سیاست میں اقتدار اور طاقت کی کشش ہوتی ہے اور عام انسانی کمزوری ہے کہ اقتدار اور طاقت ہی کی طرف لوگ کھنچتے ہیں۔

اس سلسلے میں بعض مسلم مفکرین کا خیال ہے کہ اب زمانے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ جب تک سیاسی طاقت اور حکومتی اقتدار حاصل کرکے اسلامی قوانین کا نفاذ نہیں کیا جائے گا، مسلم معاشروں کو اس کا موقع نہیں ملے گا کہ وہ اپنے آپ کو اقدار اسلامی کے سانچے میں ڈھال کر غیر اسلامی افکار و اقدار کی 'مداخلت بیجا' اور اُن کے مضر اثرات کے نفوذ کی روک تھام کرسکیں، خاص طور پر جب ان کی ترقی و اشاعت میں دنیا کی عظیم سیاسی اور فوجی طاقتیں بھرپور حصہ لے رہی ہیں بادی النظر میں تو ایک حد تک یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے، لیکن بنیادی طور پر ہم اس نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہیں اور ہمارے خیال میں روحِ اسلام سے بھی اسے مطابقت نہیں ہے۔ ہمارا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ اُن معاشروں میں جہاں 'نظام اسلام' کی کسی خاص 'تعبیر' کو حکومت کے جبر سے نافذ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، انتشار ہی پیدا ہوا ہے اور اُن کے افراد میں منافقانہ رویے ہی نے راہ پائی ہے۔ اسلام کا اولین مقصد تو یہ ہے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان ایسا رشتہ قائم کرنا چاہتا ہے جو بے لوث اور بے غرض ہو، تعلق باللہ میں جہاں ایک طرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سب پر محیط ہے، وہیں یہ بھی ہے کہ اس کی رحمت عام ہے اور اس رحمت بیکراں میں محبت کا وہ لطیف جوہر بھی شامل ہے جس کا عکس قلب پر پڑتا ہے تو انسان کی پوری پوری قلب ماہیت ہوجاتی ہے۔ اس طرح، اس نوع کا تعلق باللہ حکومت کے جبر اور تشدد سے نہیں پیدا ہو سکتا۔ اور جب تک بندوں کا خدا سے یہ گہرا تعلق قائم نہیں ہوجاتا، اخلاص اور صدق دلی پر مبنی کوئی اسلامی معاشرہ، جو صحیح معنوں میں اسلامی ہو، قائم نہیں ہو سکتا۔ پھر جہاں حکومت کے جبر و استبداد کو اولیت حاصل ہوجائے، وہاں خیال و عقیدے کی آزادی اور اخلاقی اقدار کا احترام باقی نہیں رہتا۔ حکومت میں طاقت کا عنصر شامل ہے جسے قوت نافذہ سے تعبیر کیا جاتا ہے، لیکن اس طاقت کو 'صراط مستقیم' پر رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ حکومت

ہے کہ 'اسلامی بیداری' کی موجودہ کیفیت وکمیت کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ اب جب کہ ایشیا وافریقہ کے مسلم ممالک ایک طویل عرصہ کے بعد مغرب کی سیاسی بالادستی اور سامراجی غلبہ سے نجات حاصل کرچکے ہیں، ایک بار پھر اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ اسلام کو اپنی سرزمین پر مستحکم اور مضبوط دیکھیں یہ خواہش اور یہ کوشش بے جا بھی نہیں کہ ان ملکوں کی زبان وادب، تاریخ وثقافت، اخلاق اور رسم ورواج پر اسلامی تعلیمات واقدار کی گہری چھاپ ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان ممالک کے مسلمانوں کی ایمانیات وروحانیات کا دوسرا نام اسلام ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب پوری زندگی کا محور اسلام ہی ٹھہرا تو پھر اس کے استحکام کو معاشرہ کے تمام مسئلوں میں اوّلیت کا درجہ ملے گا۔

دوسرا اہم سبب اس صورت حال کے پیچھے وہ شدید ردعمل ہے جو مغربی تہذیب کی نفس پرستانہ زدلیدگی کے خلاف اب عام ہوتا جارہا ہے اور خود مغرب میں صاحب بصیرت اور حساس افراد اپنی تہذیب کی بنیادی کمزوریوں کا بھرپور احساس رکھتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ مغرب میں نئی نسل کے لوگ اپنی تہذیب، اپنی سماج اور اپنے نظام سے مطمئن نہیں ہیں اور ان میں خاصی تعداد ایسے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی ہے جو یا تو منشیات کے خواب آور ماحول میں گم ہوکر رہ جانے ہی کو اپنے روحانی وذہنی انتشار کا مداوا سمجھ بیٹھے ہیں یا پھر مغربی طرز زندگی سے اوب کر اپنے قلب ونظر کی تسکین کے لیے کسی اور طرز زندگی اور فلسفۂ حیات کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ اس لیے یورپ اور امریکہ کے حالات کا مشاہدہ وتجربہ کرنے کے بعد وہاں کی درس گاہوں میں تعلیم پائے ہوئے نئی نسل کے مسلم دانش وروں، ڈاکٹروں، انجینیروں اور دوسرے پیشوں سے متعلق افراد ہیں، جن کا عقیدہ اور یقین یہ ہو کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو مادیت اور روحانیت کے مابین ایک خوشگوار امتزاج کی بشارت دیتا ہے، اگر مغربی تہذیب وافکار کے خلاف کوئی ردعمل ہو تو ہمیں نہ تو تعجب ہونا چاہیے اور نہ بہت زیادہ گھبرا اٹھنا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ اس صورت حال کا ہمدردی اور سنجیدگی سے مطالعہ اور مسئلہ کی اصل نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

جس زمانے میں مسلم ممالک پر مغرب کا سیاسی اقتدار قائم تھا یا وہ سیاسی طور پر مغرب کے زیر اثر تھے، مسلمانوں کی مذہبی واصلاحی تحریکیں زیادہ فعال اور موثر تھیں اور ان کا اثر نیچے کی سطح تک بھی پہنچتا تھا۔ ان کے بیشتر رہنما اور کارکن مخلص اور دیانت دار تھے اور دل وجان سے اپنے ہم مذہبوں کی اخلاقی ومعاشرتی اصلاح کے کام میں لگے ہوئے تھے۔ ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی۔ اس کے مفید نتیجے بھی نکلے اور آج کی اس 'بیداری' میں ان کی محنتوں کا بھی بہت کچھ حصہ

قوانین اجتماعی تک محدود سمجھنے والے اسلام کی کوئی مفید خدمت انجام نہیں دے رہے ہیں۔

اس عہد جدید میں اسلام کو اس نظریہ سے شدید نقصان پہنچا ہے کہ بعض لوگوں نے ردعمل کے طور پر اسے اسی طرح کی ایک تحریک تصور کیا جیسے کہ اشتراکی تحریک اور انھوں نے اسی نہج پر اپنے خیالات اور طریقۂ کار کو ترتیب دینے کی کوشش کی، اس پر مستزاد یہ کہ ان لوگوں نے مسلم معاشروں کو اسی بندھے ٹکے تصورات کے مطابق ڈھالنے کا بیڑا اٹھایا جو عہد وسطیٰ میں مسلم معاشروں میں رائج تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب اسلامی دنیا کو مغربی سامراج سے سیاسی آزادی نصیب ہوئی تو اس طرف توجہ کم گئی (اور بعض ملکوں میں تو بالکل کی ہی نہیں گئی) کہ معیشت پر اب بھی مغرب کی بالادستی قائم ہے۔ اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصہ میں معاشی خوشحالی کے آثار و اسباب پیدا ہوئے لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ اس خوشحالی کا فائدہ صحیح معنوں میں مغرب ہی کو پہنچا اور کثیر مقدار میں درآمد کی ہوئی چیزوں اور فوجی، معاشی اور تکنیکی ماہرین اور مشیروں کے جلو میں مغربی تہذیب اپنی اچھائیوں اور برائیوں کے ساتھ حکمراں طبقے اور دولت مندوں اور خوشحالوں کے نئے طبقے، سبھی پر چھا گئی۔ پھر ان ملکوں میں دولت کی تقسیم غیر منصفانہ ہی رہی اور استحصال کی نئی نئی شکلیں سامنے آئیں۔ قدیم شہروں کی آبادیاں صنعت اور کاروبار کے فروغ کے سبب بہت بڑھ گئیں اور نئے صنعتی شہر بھی آباد ہوئے۔ اس تمام ڈویلپمنٹ کا اثر یہ ہوا کہ ان شہروں کی زندگیاں پیچیدہ بن گئیں، سماجی تعلقات کی ایسی صورتیں پیدا ہوئیں جو پہلے کبھی نہیں تھیں، امیری اور غریبی کا فرق بڑھتا ہی رہا اور دولت سمٹ سمٹ کر جن ہاتھوں میں پہنچی ان کی تعداد کم ہوتی رہی۔ ایسی صورت میں ضرورت تھی کہ نیچے سے معاشرہ کی معاشی، سماجی، تعلیمی اور اخلاقی اصلاح کی کوشش کی جائے اور اوپر سے دولت کی تقسیم منصفانہ اور سچے اسلامی اصولوں کے مطابق ہوتا کہ خوشحالی کی برکتیں ان گھروں تک بھی پہنچیں جہاں فقر و فاقہ کے سبب عام طور پر اندھیرا ہی رہتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ نہ ہوا اور وہ روحانی تربیت بھی جو ایک متوازن سماج کی تشکیل کے لیے ضروری ہے، دیرینہ عقائد کا تتمہ سمجھ کر نظر انداز ہوتی رہی اور سچی مذہبی زندگی جو اسلام کا بنیادی نصب العین ہے، قصۂ پارینہ سمجھ لی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال حساس مسلم نوجوانوں کے دلوں پر ایک بوجھ ہی ہو سکتی ہے اور اگر وہ اس بوجھ کو اٹھا کر پھینک دینا چاہیں تو اس میں حیرت اور تعجب کی کوئی بات نہیں، لیکن افسوس اس بات کا ضرور ہے کہ اسلامی تحریکوں کے قائدین نے مسلمانوں کے اس ردعمل سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش تو کی لیکن اسے وہ کسی تعمیری و اصلاحی راستہ پر نہ ڈال سکے۔ ہمیں جو تشویش ہے وہ یہی ہے کہ اس بے ساختہ اور برجستہ ردعمل کے پیچھے

کرنے والے افراد اور پوری مشینری اسلامی تعلیمات کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو اور حکومت کا مزاج روحِ اسلامی سے مطابقت رکھتا ہو۔

پاکستان اور ایران میں نظامِ اسلامی کے قیام کے لیے جو جوش و خروش پایا جاتا ہے اس کی تہہ میں اترئیے تو بڑے کھوکھلے پن کا احساس ہوتا ہے۔ عام طور پر خوف سے لوگوں کی زبانیں تو بند ہیں لیکن دل میں وہ نظامِ اسلامی کی موجودہ تعبیرات اور اس طریقۂ کار کو پسند نہیں کرتے جو ان تعبیرات کو عمل میں لانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے اور اپنے گھروں میں وہ ان پر تنقید کرتے ہیں۔ یہ صورت اخلاقی اعتبار سے بھی غیر اطمینان بخش ہے اور سیاسی اعتبار سے بھی۔ اور یہ بات ہم ان لوگوں کے بارے میں کہہ رہے ہیں جو دل سے مسلمان ہیں، خدا، رسول، قرآن، آخرت اور ملائکہ پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ اس دنیا میں ان کے اعمال کا حساب کتاب بھی ہوگا۔ ہمارے خیال میں تو قانونِ الٰہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے معاشرے میں خاصی تعداد میں ایسے افراد تیار کیے جائیں جو بے نفس ہوں، جو خدا سے ڈرتے ہوں، جو اپنے قلب و نظر کو پاک رکھتے ہوں ان تمام برائیوں سے جو حجاب بن جاتی ہیں قلوبِ انسانی اور اُن اعلیٰ اخلاقی اقدار کے مابین جن سے زندگی میں حُسن پیدا ہوتا ہے، جو حدود اللہ کو پہچانتے ہوں اور ظلم کے تصور سے ڈرتے ہوں، جو چاہتے ہوں کہ سب کے ساتھ انصاف ہو اور ظالموں اور غیر منصفوں کے خلاف، خواہ وہ ان کے اپنے ماں باپ، بھائی بند ہی کیوں نہ ہوں، گواہ بن جاتے ہوں۔ ہم جب یہ کہتے ہیں کہ 'سب کے ساتھ انصاف ہو' تو ہمارا مقصد اس سے سماجی انصاف بھی ہے، دولت کی مناسب و منصفانہ تقسیم بھی ہے اور ظلم کی وہ شکل بھی جو معاشی و سیاسی استحصال کی مختلف صورتوں میں اکثر مذہب کے نام پر بھی روا رکھی جاتی ہے۔

اسلام کوئی سیاسی تحریک نہیں ہے اور اس کا مرکزِ اصلی کوئی 'اسٹیٹ' نہیں۔ اسلام ایک مذہب ہے اور مذہب کا بنیادی مقصد اصلاحِ انسان ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ دنیا کے بعض مسلم معاشروں میں سیاست جو دین کا صرف ایک اضافی حصہ ہے، دین کا اعتقادی حصہ بن گئی ہے۔ اسلام میں قوانین مقصود بالذات نہیں بلکہ ان سے معاشرے کی تنظیم میں کام لیا جاتا ہے اس طرح کہ معاشرہ کی استعداد و صلاحیت کے بقدر وہ اس میں نافذ کیے جاتے ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قانونِ اسلامی کے نفاذ اور عدمِ نفاذ کو ایمان و کفر اور جنت و جہنم کا مسئلہ بنا دیا گیا ہے اور اسی لیے ہمارا خیال ہے کہ اسلام کو "جنگِ سیاست گری" کا نعرہ بنا دینے والے یا اسلام کو محض

# کُلُّ مَن علیہا فان

۲۲ر ستمبر کو جماعت اسلامی کے بانی اور دنیائے اسلام کے مشہور اہل قلم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا امریکہ کے شہر بیفلو کے ایک اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم وہاں علاج کے سلسلے میں مقیم تھے۔ ان کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوگئی ہے وہ آسانی سے بھری نہ جاسکے گی۔ اس لحاظ سے یہ ایک بڑا نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

مولانا مودودی نے ۷۶ برس کی عمر پائی۔ سن بلوغ کو پہنچ کر جس طرح انھوں نے تعلیم حاصل کی اور جس محنت اور دیدہ ریزی سے انھوں نے اپنی علم کی پیاس بجھائی وہ قابلِ رشک ہے۔ ان کے سوانح نگار کے لیے ان کے ذہنی ارتقار میں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو ایک اعلیٰ درجے کے صاحب طرز مصنف اور ایک ممتاز شخصیت کی خصوصیت ہوتی ہے۔ ان کا اسلوب منفرد تھا اور ان کے قلم میں بڑی قوت تھی۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے زورِ قلم سے مسلمانانِ ہند میں اپنا ایک خاص مقام پیدا کیا اور اپنی جودت فکر سے دنیائے اسلام کی ایک ممتاز فکری قوت بن گئے۔ انھوں نے بہت سوچا اور بہت کچھ لکھا، ان کے بعض خیالات سے اہلِ نظر علما نے اتفاق نہیں کیا اور اُن کی بعض رائیں روایت سے بغاوت سمجھی گئیں، لیکن اس کے باوجود ان کے فکر کی چھاپ جدید اور قدیم تعلیم یافتہ طبقے کے خاصے بڑے حصّے پر پڑی اور گہری

کوئی گہری فکر نہیں ہے اور اندیشہ ہے کہ کہیں عمل اور ردعمل کا کوئی ایسا سلسلہ نہ شروع ہو جائے جو مسلم معاشروں کی مزید تباہی کا سبب بن جائے۔

ہمارا خیال ہے کہ ایران اور پاکستان میں، اور اسی طرح دوسرے مسلم ممالک میں بھی، نہ تو سچی اسلامی زندگی کے قیام کے لیے کوئی نتیجہ خیز کام ہوا ہے اور نہ سماجی و معاشی اصلاح کی طرف توجہ کی گئی ہے۔ آج بھی اسلامی اصولوں کے مطابق ایک مستحکم اور متوازن معاشرہ کی طرح ڈالی جا سکتی ہے، یہ ہمارا عقیدہ ہے لیکن ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اس کے لیے ہمیں اپنے ان تمام سماجی، معاشی اور قانونی اداروں، کا جائزہ لینا ہوگا جس کی بنیاد تو اسلامی ہے لیکن اوپر کی تعمیر میں وہ بہت سے خارجی عناصر بھی شامل ہیں جو ان اداروں کے ارتقا کے ساتھ، وقت کے ایک مرحلے تک، ان کا ایک ضروری حصہ بن گئے۔ پھر ایسا ہوا کہ ان کا ارتقا رک گیا اور اس حالت پر صدیاں بیت گئیں اور جمود و تعطل کی کیفیت طاری رہی۔ زمانہ اور زمانے کے تقاضے بدلتے رہے اور یہ ادارے اپنی جگہ اسی طرح جمے رہے۔ اور اب جب تک قرآن و حدیث کی اصولی تعلیمات کی روشنی میں ان کا جائزہ نہیں لیا جاتا اور ان میں ضروری اصلاح نہیں کی جاتی، اس دور میں سچے اسلامی معاشرے اور اس کے معقول اور متوازن اداروں کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی۔ مسلم ممالک، خاص طور سے ایران اور پاکستان میں اس طرف خاص توجہ کی ضرورت تھی۔ افسوس ہے کہ ان ملکوں میں اس طرف سے پوری غفلت برتی گئی ہے اور جو افراد اقتدار میں ہیں وہ خود جمود، تعصب اور تنگ نظری کے شکار ہیں۔

اپریل و جولائی ۱۹۷۹ء

انکار ، نظریات کے قلعوں پر حملہ کیا اور یہ بتایا کہ یہ جو ان نظریات کے جلو میں سیاسی نظام، معاشی نظام وغیرہ کی مرّوجہ کئی اصطلاحیں سامنے آرہی ہیں، ان کی بنیادیں اتنی ہی کھوکھلی ہیں جتنے کہ وہ نظریے جن پر ان کی اساس ہے۔ اور اگر نظام ہی کی بات ہے تو اسلام خود ایک مکمل نظامِ حیات اور ایک بے عیب ضابطۂ زندگی ہے۔ مولانا مرحوم نے اپنی اس بات کو اس قدر جرات، استقامت اور بلند آہنگی سے پیش کیا کہ اس سے متاثر ہونے والے مسلمانوں کے تاریک اور منجمد ذہنوں میں حرکت پیدا ہوئی اور انھیں اپنے آپ پر اور اپنی ایمانیات پر ایسا اعتماد پیدا ہوا کہ اگر ایک طرف وہ مغربی تمدن کی تابناکی سے مرعوب نہیں ہوئے تو دوسری طرف وہ نسلی اور اصلی مسلمانوں کی تحریق میں غلو کرنے لگے، دنیا کے تمام سیاسی و معاشی نظاموں کی بنیادی کمزوریوں کو واشگاف اور مسلمانوں کو نیشنلزم کے فتنے کی طرف متنبہ کرتے ہوئے، خواہ وہ انڈین نیشنلزم ہو یا مسلم نیشنلزم، مولانا نے حکومت الٰہیہ کے اسرار و غوامض اس طرح کھولے اور اس کے قائم کرنے والوں کی خصوصیتیں اس طرح بیان کیں کہ ان کے متاثرین کا ایک خاص ذہن بن گیا اور 'جماعتی مسلمان' دوسرے مسلمانوں سے الگ، اپنے آپ کو اعلیٰ و ارفع سمجھنے لگے۔ اقامتِ صالح کا جو ایک قرآنی مفہوم تھا اور جو صدیوں سے مسلمانوں کے معاشرے اور ادبیات میں متداول تھا، اس نے اب ایک نئی صورت اختیار کرلی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ ہندی مسلمانوں میں ایک خاص مکتب فکر اور ایک خاص تحریک وجود میں آگئی جس کے اثرات دوررس ثابت ہوئے یہاں تک کہ مولانا مودودی کی جو تحریریں دوسرے مسلم ممالک میں عربی، انگریزی اور دیگر زبانوں میں ترجمہ ہوکر پہنچیں، وہاں بھی ان کا خاصا اثر ہوا۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیائے اسلام میں ان کی وفات کو ایک بڑا سانحہ تصور کیا گیا ہے۔

اس عہد جدید میں تقریباً تمام مصلحین نے تقلید اور اجتہاد سے متعلق کچھ نہ کچھ کہا ہے، تصوف کے بارے میں بھی انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ بات متقدمین اور متوسطین میں بھی ملتی ہے۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے بھی ان موضوعات پر لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ امور ہیں جن پر اختلاف رائے ناگزیر ہے۔ بیچ کی راہ صحیح راہ ہے، لیکن درحقیقت بیچ کی راہ ہے کیا اسی کی تلاش میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ یہ اختلاف بہت نمایاں نہیں ہوتا اگر اظہار رائے محض فرد یا ایک مرنجان مرنج حلقے ہی تک محدود رہتا ہے۔ لیکن اظہار رائے باضابطہ ایک مکتب فکر اور تحریک بن جائے تو اختلاف شدت اختیار کرتا ہے اور صف آرائی ہونے لگتی ہے۔ کچھ ایسی ہی

پڑی، خصوصاً جدید تعلیم پائے ہوئے نوجوانوں کا ایک بڑا طبقہ اُن سے کافی متاثر ہوا۔ یہ وہ طبقہ تھا اور یہ طبقہ اب بھی ہے جو اگر مولانا مودودی کی تحریریں نہ پڑھتا تو غالباً اسلامی عقائد و تعلیمات پر اُسے وہ اعتماد حاصل نہ ہوتا جو ذہنی و فکری تسکین سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھیے تو مولانا مودودی نے اپنی تحریروں سے وہی کام لیا جو کبھی اسلام کے متکلمین کی نمایاں خصوصیت تھی۔

غور سے دیکھیے تو مغرب کے ملحدانہ افکار کے مقابلے میں مولانا مودودی نے جو موقف اختیار کیا اور اپنے خاص اسلوبِ نگارش سے پورا پورا کام لے کر اُردو زبان میں جس طرح اپنے موقف کی وضاحت اور اشاعت کی، وہ درحقیقت انھیں خیالات کی بازگشت ہے جنھیں اپنے اپنے انداز پر عرب دنیا میں مفتی محمد عبدہ، رشید رضا اور سلفیوں نے اور ہندوستان میں علامہ شبلی، ابوالکلام آزاد اور اقبال نے پیش کیا تھا۔ اپنی اس رائے سے میں مولانا مودودی مرحوم کے مرتبے کو کم نہیں کرنا چاہتا، میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہر مصلح اور ہر مفکر جو مسلمان ہے اور جس کی رگ و پے میں اسلام کی حقانیت سرایت کیے ہوئے ہے وہ کتاب و سُنّت سے الگ ہو کر کوئی اور بات نہیں کہہ سکتا۔ وہ جب بھی فلاح و صلاح کی طرف بُلائے گا تو کتاب و سُنّت ہی کی طرف بلائے گا، وہ جب بھی انسانوں کے روحانی و اخلاقی امراض کا مداوا پیش کرے گا تو اُسی نسخۂ کیمیا سے پیش کرے گا جسے خدا کا ایک محبوب بندہ غارِ حرا سے انسانوں کی بستی میں لایا تھا، جب بھی وہ انسانی معاشرہ کے فساد اور بگاڑ کی ظلمتوں کو دور کرنے کے لیے اُٹھے گا تو اس کے ہاتھ میں کتاب و سُنّت ہی کی روشنی ہوگی۔ اور یہ سب وہ اس لیے کرے گا کہ وہ اسلام کو فطرت انسانی سے مکمل طور پر ہم آہنگ تصور کرتا ہے اور اس کا یہ ایمان ہے کہ انسان کے بنائے ہوئے نظریوں میں مادیت اور روحانیت کے مابین کبھی وہ توازن قائم ہی نہیں ہو سکتا جو دینِ فطرت کی خصوصیت ہے۔ انسان کا بنایا ہوا ہر نظریہ یک رُخا ہوگا جو اُس کے مادی اور روحانی مطالبوں کو یکساں طور پر پورا نہیں کر سکتا۔

اگر صورت یہ ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی بات ہے جس کی بنا پر اہل الرائے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے نے مولانا مودودی کی وفات کو دنیائے اسلام کے ایک بڑے سانحے سے تعبیر کیا ہے۔ میرے خیال میں اس سلسلے میں سب سے پہلے تو ہمیں ان کے مخصوص اسلوبِ نگارش، اقدامی موقف، جدید طرزِ استدلال، اور علمی اندازِ بیان کو خراجِ عقیدت پیش کرنا چاہیے۔ ان ہتھیاروں سے لیس ہو کر انھوں نے مغرب کے ملحدانہ

تحقیقات نامعتبر ہیں۔

مولانا مودودی ہندوستان میں تھے تو ایک صالح معاشرے کی تشکیل کے لیے کوشاں تھے اصلاح معاشرہ کے بعد ہی حکومت الٰہیہ یا اسلامی حکومت کا قیام ممکن نظر آتا تھا۔ مسلم نیشنلزم کی بنیاد پر پاکستان کا وجود عمل میں آیا تو وہ بھی رفتہ رفتہ اسی طاغوتی سیاست کا شکار ہو گئے، جس کی انھوں نے پُرزور مخالفت کی تھی۔ اب مقصد یہ قرار پایا کہ غیر اسلامی طریقہ کار ہی سے سہی، کسی طرح حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں آنی چاہیے، پھر شرعی قوانین کے نفاذ کے بعد حکومت اسلامی ہو جائے گی۔ یہ ایک طرح کی قلب ماہیت تھی جماعت اسلامی (پاکستان) کی اور اس سلسلے میں بعض ایسے مرحلے پیش آئے جب مولانا اور ان کی جماعت کے نظریات اور پاکستانی سیاست کے حالات کے مابین تصادم ناگزیر ہو گیا، لیکن مولانا نے ایسے تمام مرحلوں میں جماعت کی سرگرمیوں کا جواز "حکمت عملی" کی اصطلاح کی صورت میں پیش کیا۔ میرا خیال ہے کہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی دونوں کے لیے نظریاتی سطح پر اس صورت حال میں ایک سخت آزمائش تھی اور اس کا نتیجہ معنوی اعتبار سے جماعت کے حق میں اچھا نہیں نکلا۔ ضرورت تھی کہ پاکستان پہنچ کر وہ حکومتی اقتدار کو جماعت کی طرف منتقل کرنے کی کوششوں کے بجائے، پاکستان کے مسلم معاشرے کی اصلاح کا کام تیز تر کر دیتے اور اس کی بنیادوں کو اسلامی نہج پر مضبوط تر کرتے تاکہ اس سوسائٹی میں اسلامی حکومت کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی، پیغمبر اسلامؐ کی مکّی اور مدنی زندگی اور ترتیب نزول قرآن کے گہرے مطالعے سے ترتیب کار کا اُلوہی منصوبہ کچھ اسی طرح نظر آتا ہے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا اور جماعت اور اس کے نہایت ذہین اور خداداد صلاحیت کے حامل قائد کی توانائیاں ثانوی درجے کے امور پر مرکوز ہو کر رہ گئیں۔

مولانا مودودی اب اس دنیا میں نہیں رہے، لیکن ان کا نام باقی رہے گا اور ان کی جماعت، ان کے پروگرام کو جاری رکھے گی۔ اس سلسلے میں ہر مکتب فکر کے لوگوں میں اُن کے افکار و نظریات پر بحث بھی جاری رہے گی۔ میرا اندازہ ہے کہ جس رفتار سے یہ بحث چلے گی اُسی رفتار سے مولانا مودودی کے فکر کی خصوصیات اُبھر اُبھر کر سامنے آئیں گی کیوں کہ ان کے فکری اور تصنیفی کارنامے ایسے نہیں ہیں جنھیں لوگ جلد بھول جائیں گے۔ یہی کارنامے ان کی یادگار ہیں جو زندہ رہیں گے اور مولانا مرحوم کو بھی زندہ رکھیں گے۔

---

صورت تقلید، اجتہاد اور تصوف سے متعلق مولانا مودودی اور اُن کی جماعت اور دوسرے علماء کے مابین پیدا ہوگئی۔ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے ان امور سے متعلق اپنے موقف کو صحیح سمجھا اور دوسرے علماء نے جن میں اکثر صاحب فکر و نظر ہیں، اور جن میں کئی ایسے ہیں جو عرصے تک مولانا مودودی کے ہمنوا اور دست راست رہے ہیں، ان کے موقف کی کمزوریاں واضح کیں، ایسا بھی ہوا کہ فریقین میں بحث اتنی تلخ رہی کہ دونوں طرف سے ناخوشگواریوں کے مظاہرے بھی ہوئے۔ یہ درحقیقت ایک فکری کشاکش ہے روایت پر استقامت اور روایت سے بغاوت کے مابین۔ یہ فیصلہ تو راسخ العلم حضرات کریں گے کہ اس استقامت اور اس بغاوت کی حدیں کیا ہیں۔ لیکن میں اس فکری کشاکش کو زندگی کی علامت تصور کرتا ہوں۔ زندگی کشاکش کے سہارے ہی آگے بڑھتی ہے، یہ نہ ہو تو جامد اور معطل ہوکر رہ جاتی ہے۔

اسلام میں دین کا ایک خاص تصور ہے جس میں عبادت کو مرکزی حیثیت اس لحاظ سے حاصل ہے کہ اس کے ذریعے خدا اور بندے کے درمیان ہر آن اور ہر لمحہ اس تعلق کی تجدید ہوتی رہتی ہے جیسے قرآن کریم میں سورہ الاعراف کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:

> "اور جب آپ کے رب نے اولادِ آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے ان ہی کے متعلق اقرار لیا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا کہ کیوں نہیں؟"

اسی طرح رب اور الٰہ بھی قرآنی کلمات ہیں اور ان کی اسلامی تعبیرات و تشریحات موجود ہیں جن پر صدیوں سے اجماع ہے۔ رسول اللہؐ کے صحابہ کرامؓ کے مقام و مرتبہ سے متعلق بھی مسلمانوں کے سوادِ اعظم کا ایک اجماع ہے۔ مولانا مودودی نے دین، عبادت، رب اور الٰہ کی اسلامی اصطلاحات کو نیا مفہوم دینے کی کوشش کی۔ صحابہ کرامؓ سے متعلق جو اجماع رہا ہے اس سے ہٹ کر چلنے کا ارادہ کیا، حدیث کی جانچ کے معاملے میں ذوق کو معیارِ حق بنانا چاہا اور بعض کمزور اور بے بنیاد شہادتوں کو قبول کرکے اپنی کتاب 'خلافت و ملوکیت' میں صحابہ و تابعین کی ثقاہت و دیانت کو مجروح کیا۔ میرے نزدیک یہ وہ باتیں ہیں جن سے، ان کے علم و فضل کے اعتراف اور ان کی دینی خدمات کے احترام کے باوجود، ان کی کم نگاہی اور فکری کمزوریوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ ان باتوں سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ ان کے بعض علمی اصول ناقص اور ان کی بعض

# چودھویں صدی

اسلامی کیلنڈر کے ۱۳۹۹ سال پورے ہوگئے اور امسال ماہ ذی الحجہ کی آخری تاریخ کو چودہ سو برس پورے ہو جائیں گے۔ گذشتہ سال ہی سے اسلامی دنیا کے مختلف مقامات سے اس سلسلے میں لٹریچر اور اطلاعات موصول ہو رہی ہیں جن سے مسلمانوں کے اس عزم کا پتہ چلتا ہے کہ وہ پندرھویں صدی کا استقبال بڑے جوش و خروش اور بڑے نیک ارادوں سے کرنا چاہتے ہیں، اسی کے ساتھ ہی وہ غالباً اپنی تاریخ کی ماضی کی صدیوں کا جائزہ بھی لینا چاہتے ہیں، کانفرنسوں، سیمناروں، کتابوں کی طباعت اور قرآن کریم کی تعلیمات کی اشاعت کا پروگرام بھی ہے، غرض گوناگوں تقریبات منعقد کرنے اور ان کے توسط سے پوری دنیا کو اسلام کی تعلیمات کی گونج سے معمور کر دینے کا منصوبہ ہے۔ عہد حاضر میں کام کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے، بشرطیکہ لوگوں میں اخلاص ہو، نمود و نمائش کے جذبے سے دل پاک ہوں اور صرف اللہ اور رسولؐ کے لئے کچھ کر جانے کی تڑپ ہو، مجھے تو کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ چودہ سو برس کی مدت پوری ہو جانے پر خوشی اور مسرت کے جشن منانے کا منصوبہ کوئی ایسی اہم بات نہیں جس کے لئے لاکھوں کروڑوں کی رقم صرف کی جائے، خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ آج کل صدی منانے کا ایک فیشن سا ہو گیا ہے۔ خدا کرے میرا احساس غلط ہو اور دنیا بھر کے مسلمان سادگی اور انکساری اور اس جذبے کے ساتھ پندرھویں صدی کا استقبال کریں کہ انھیں آیندہ اپنے آپ کو اسلام کی سچی تعلیمات کے مطابق ڈھالنا ہے،

گزشتہ دنوں رمضان المبارک کی آخری تاریخ کو مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی جو "اسلام اور عصر جدید" کی مجلس ادارت کے ایک اہم رُکن تھے، ہمیشہ کے لیے ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فاضل تھے اور انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ ندوہ میں وہ استاد تھے اور کچھ دن اُردو صحافت میں بھی گزار چکے تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں وہ برسوں استاد اسلامیات اور ناظم دینیات رہے۔ وہ جہاں بھی رہے اور جس منصب پر بھی فائز رہے، انھوں نے اپنا کام نہایت خوش اسلوبی اور فرض شناسی سے انجام دیا۔ جامعہ ملیہ سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ دارالمصنفین میں شریک ناظم ہوکر چلے گئے اور ندوہ کے تعلیمی و تدریسی کام کو بھی معتمد تعلیمات کی حیثیت سے دیکھتے رہے۔ ان کی شخصیت میں ایسی جاذبیت تھی کہ ان کے ساتھی ان کے گرویدہ رہتے تھے۔ انھیں لکھنے کا نہایت اچھا سلیقہ تھا اور بولنے میں بھی ان کی اپنی منفرد شان تھی۔ صحیح اور شگفتہ اُردو لکھتے اور عبارت میں ایسی روانی ہوتی کہ پڑھنے والا مسحور ہوکر رہ جاتا۔ گفتگو یا تقریر کرتے تو بڑے نرم لہجے میں، درحقیقت اس سلسلے میں اُن کی پُرتاثیر سادگی اور براہ راست انداز بیان سننے والوں کا دل جیت لیتا۔ میں نے ایسے مقرر کم دیکھے ہیں کہ کم سے کم لفظوں میں ایسے موثر انداز میں بات کہہ دیں کہ چوٹ دل ہی پر لگے اور جی چاہے کہ تقریر ابھی جاری رہے۔

مولانا عبدالسلام قدوائی مرحوم نہایت بے غرض اور نیک نفس انسان تھے دلوں کی پاسداری اور ایک خوش گوار وضعداری ان کی شخصیت کا حُسن تھا۔ وہ ایک وسیع النظر دیدہ ور اور بلند پایہ عالم تھے۔ قرآن، حدیث، فقہ اور تاریخ اسلام پر ان کی نظر گہری تھی۔ مزاج میں رواداری اور خیالات میں توسع تھا اس لیے جدید تعلیم یافتہ طبقہ بھی ان کی مجلس میں بیٹھتا اور استفادہ کرتا۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہمیشہ سے مختلف الخیال لوگ رہے ہیں، مولانا مرحوم بھی حلقوں میں محبوب و مقبول تھے۔ جمعہ کے دن مسجد میں ان کا جو اُردو خطبہ ہوتا تھا، جدید اور قدیم دونوں طرز کے پڑھے لکھے لوگوں میں پسند کیا جاتا تھا اور لطف یہ ہے کہ عوام بھی اسے پسند کرتے تھے۔ میرے نزدیک یہ کمال کی بات ہے۔ اپنی وسیع النظری سے انھوں نے کبھی یہ فائدہ نہیں اٹھایا کہ روایت سے سرمو انحراف کریں۔ اس سے ان کے تبحر علمی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ آج وہ ہم میں نہیں ہیں تو بہت یاد آتے ہیں۔ اُن کی وفات سے فکر و عمل کی جو مسند خالی ہوئی ہے اس پر اس صلاحیت کا عالم شاید ایک عرصے تک میسر نہ آئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ہم سب کو صبر جمیل کی توفیق عطا کرے۔

اکتوبر ۱۹۷۹ء

پہلے ہی مغرب کی سیاسی و اقتصادی و تہذیبی بالادستی قائم ہو چکی تھی اور پوری دنیائے اسلام اس کی زد میں تھی، ایک وقت وہ تھا جب مسلمانوں نے پھیل کر مغرب کو اپنی زد میں لے لیا تھا، اسپین کی فتح کے بعد انھوں نے فرانس کے جنوبی اور جنوب مغربی حصے اور اٹلی کے جنوبی حصہ پر اپنے اثر و اقتدار کا پرچم لہرا کر پورے بحیرۂ روم کو اپنی دنیا کی ایک جھیل بنا لیا تھا۔ صلیبی جنگوں میں یوروپ نے بہت ہاتھ پیر مارے کہ بحیرۂ روم اور بحیرۂ قلزم پر اس کا اثر قائم ہو جائے، لیکن اسے منہ کی کھانی پڑی ۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں صورت حال بدل چکی تھی، ایک سلطنت عثمانیہ تھی جو خود اپنے ہی تضادات کا شکار تھی، لیکن اس کے باوجود جب تک بن پڑا اس نے مزاحمت کی، آخر میں اس کے بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ۔ مغرب گوناگوں علمی، تہذیبی، سیاسی اور اقتصادی انقلابات سے گذر کر اب بے پناہ توانائیوں کے ساتھ سامنے آیا تھا جنھیں وہ ایشیا اور افریقہ میں بکھیر دینا چاہتا تھا، لیکن یہاں اس کی راہ میں وہی اسلامی دنیا حائل تھی جس کی اجازت کے بغیر کبھی بحیرۂ روم میں اس کے جہاز نہیں چل سکتے تھے۔ اس نے صلیبی جنگوں کو فراموش نہیں کیا تھا، اس لئے اس صدی کے آغاز میں بھی جب وہ مقابل ہوا تو نئی سائنس اور ٹیکنولوجی اور روشن امکانات سے معمور اقتصادی تقاضوں کی زبردست طاقت کے ساتھ اس میں ایک قسم کا وہ مذہبی جوش بھی تھا جس کے مظاہرے پچھلی صدیوں میں اس کی طرف سے ہو چکے تھے ۔ اِدھر اسلامی دنیا کمزور تھی، اور ہر لحاظ سے کمزور تھی، اس کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس میں کسی اعلیٰ مقصد اور اس کے لئے سب کچھ کر گذرنے کا جذبہ یکسر مفقود تھا، اسلام کا نام سب لیتے تھے لیکن اسلام کی سچی روح اور قوت محرکہ کا عام فقدان تھا، پھر باہمی اختلافات نے اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا اور دنیائے اسلام کے مادی وسائل بوسیدہ اور بہت محدود تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم علاقے ایک ایک کر کے مغرب کے محکوم بن گئے ۔ جو علاقے سیاسی طور پر آزاد رہے وہ بھی مغربی تہذیب کے غلام تھے ۔ سیاسی اور اقتصادی محکومی کے ساتھ سب سے بڑی مصیبت یہ آئی کہ مغربی استعمار نے ایک طرف تو عیسائی مشنریوں کی بھرپور ہمت افزائی کی اور دوسری طرف جدید تحقیق

ملّت اسلامیہ کو دنیا کی ایک بااثر روحانی اور مادی طاقت بنانا ہے اور تاریخ انسانی میں ایک بار پھر وہی اخلاقی اور تہذیبی رول ادا کرنا ہے جو اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ہمارے اسلاف نے ادا کیا تھا۔ غور سے دیکھیے تو ایک مسلمان کی روزمرہ کی عبادت کا جو نظام ہے اس کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی ہے کہ انسان کو ہر آن اپنی عبدیت کا احساس رہے اور ہر لمحہ اس کی نظر اپنے اعمال پر اس طرح رہے کہ وہ دیکھے کہ اُس کا کوئی قدم اللہ کی بتائی ہوئی راہ سے نہیں ہٹتا۔ مسلمان صبح کو بستر سے اٹھتا ہے، سورج نکلنے اور دنیا کا کاروبار شروع کرنے سے پہلے ہی خدا کے حضور میں حاضر ہوتا ہے، دوپہر کو ذرا دم لے کر ظہر کی نماز ادا کرتا ہے، اس کے بعد پھر مشاغل حیات کی ہنگامہ آرائیوں میں بھی وہ عصر اور مغرب کے وقت اپنے پیدا کرنے والے کی بارگاہ میں سربسجود ہو جاتا ہے، پھر سونے سے پہلے وہ عشاء کی نماز پڑھتا ہے اور اپنی دن بھر کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا ہے، اپنی خطاؤں پر استغفار کرتا ہے، اپنے اچھے کاموں پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور کل کے لئے نیک ارادوں کے ساتھ تسبیح و تحمید کرتا ہوا سو جاتا ہے۔ ہمارے اسلاف کا طریقہ یہی تھا اور انھوں نے دنیا میں ایک انقلاب برپا کر کے تاریخ کے دھارے کو موڑ دیا تھا، جس نظام عبودیت میں ہر آن اور ہر لمحہ اپنی زندگی کا جائزہ لیتے رہنے کی تعلیم ہو وہاں گذشتہ صدیوں کا جائزہ لینے اور آیندہ صدی میں کوئی جہتم بالشان کارنامہ انجام دینے کا نیک ارادہ کر لینے کا معاملہ داستان بستون و کوہکن کی صبر آزمائیوں کی یاد تازہ کرنا ہے۔ لیکن چلئے تمام صدیوں کا نہ سہی، چودھویں صدی ہی کا ایک مختصر جائزہ لے لیا جائے، اسی کے چند اہم نقوش ابھر کر سامنے آجائیں اور دیکھا جائے کہ اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں اور آیندہ ہمیں کس طرف جانا چاہیئے۔

مذہبی، روحانی، اخلاقی، سیاسی، اقتصادی اور تہذیبی اعتبار سے قرون وسطیٰ کی صدیوں سے ہم کو جو کچھ ملا تھا مجموعی طور پر اس کی نمایاں خصوصیت جمود تھا اور جمود و تعطل کی جو خرابیاں اور کمزوریاں ہوتی ہیں وہ اہل نظر پر ظاہر ہیں۔ چودھویں صدی کا آغاز (یعنی ۱۸۸۲ء) ہوا تو شکست و ریخت دنیائے اسلام کا مقدر بن چکی تھی۔ اس صدی کے شروع ہونے سے

تہذیب ہوتی تو اس طوفان میں خس وخاشاک کی طرح بہہ گئی ہوتی۔ لیکن واقعات نے ثابت کر دیا کہ اسلامی تہذیب کی بنیادیں نہایت مضبوط تھیں، اس کا تصور کائنات، اس کی ایمانیات اس کے دینی افکار و عقائد جن میں ایمان بالغیب کو جو اپنی جگہ سے کبھی نہ ٹلنے والی چٹان کی مانند ہے، مرکزیت حاصل ہے، ایسے مستحکم ہیں کہ معنوی اعتبار سے یہ سب مل کر خود ایک ایسے سیل کی طرح ہے جو ہر سیل کو، خواہ وہ کسی طرف سے آئے اور کسی روپ میں آئے، نہ صرف یہ کہ تھام لیتا ہے، روک دیتا ہے بلکہ اس کا منہ پھیر دیتا ہے۔ اور یہ بات میں جذباتیت سے عاری ہو کر ایسی حقیقتوں کے پیش نظر کہہ رہا ہوں جنھیں ان آنکھوں نے تاریخ کے اوراق میں پڑھا اور مشاہدات کی دنیا میں دیکھا ہے۔ یہاں اس کا موقع نہیں کہ مشاہدات و افکار کے چہرے سے پردہ اٹھایا جائے۔

ہر تہذیب کی طرح مغربی تہذیب میں شروع ہی سے داخلی کشاکش کی ایک فضا تھی، اس پر مستزاد یہ کہ تہذیب، عیسائیت کے ایک ترکیبی عنصر کے باوجود یک رخی تھی، اس میں روح انسانی کی تسکین اور انسان کی داخلی آرزومندی کے بارآور ہونے کا سامان نہ تھا، اس میں اتنا بھی تو نہ تھا کہ یہ انسان پر انسان کے ظلم وجور کو ہمیشہ کے لئے ختم کر سکتی، نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی جنگ عظیم کے آتے آتے اس کے داخلی تضادات ابھر کر اس طرح سامنے آگئے کہ ایک طرف تو ۱۹۱۷ء میں روس کا اشتراکی انقلاب رونما ہوا اور دوسری طرف جن قوتوں کو اس نے خود جنم دیا تھا، انھیں قوتوں کے سامنے یہ اپنے آپ کو بے بس پانے لگی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مغرب اس طرح پسپا ہوا کہ انھیں قوموں کے مادی وسائل کا محتاج بن گیا جنھیں کبھی اس نے غلام بنا کر لوٹا تھا۔ مسلم ممالک ایک ایک کر کے آزاد ہوئے اور ایشیا و افریقہ میں مسلمانوں میں ایک نئی زندگی کے آثار پیدا ہوئے۔ لیکن سائنس اور ٹیکنولوجی کی حیرتناک ترقی کے سبب اب دنیا سمٹ کر بہت مختصر ہو گئی تھی۔ مغربی دنیا اور اشتراکی دنیا کے مابین نیوکلیائی اسلحوں کی تیاری کے لئے جو دوڑ شروع ہوئی، اس کے نتیجہ میں امریکہ اور روس دو بڑی طاقتیں وجود میں آگئیں اور دونوں میں اپنے سیاسی و معاشی نظام اور اپنی تہذیبی اقدار کے تحفظ کی کوشش کے ساتھ یہ کشمکش بھی شروع ہو گئی کہ دنیا کے

کے پردہ میں جان بوجھ کر اسلامی تعلیمات کو مسخ کر کے پیش کرنے کا منصوبہ بنایا، قرآن، سیرت رسولؐ، قانون اسلامی اور تاریخ اسلام، سبھی کچھ اس علمی سازش کا شکار ہوئے، انگریزی، جرمن، فرانسیسی، اسپینی، اطالوی اور ڈچ زبانوں میں جو لٹریچر تیار ہوتا رہا وہ نظری طور پر علم و تحقیق کے نئے معیاروں کے مطابق تو ضرور تھا مگر حقیقت میں حقائق کے اعتبار سے اس میں بہت کمزوریاں تھیں۔ لیکن ان کمزوریوں کی نشاندہی وہی صاحب نظر علماء کر سکتے تھے جن کی نظر قدیم ماخذوں اور تفسیر، حدیث، فقہ اور سیر کی کتابوں پر گہری تھی اور جو ساتھ ہی اسلام کے دینی نظام کے صحیح مزاج اور سچی روح سے پوری طرح واقف تھے۔ استعماری طاقتوں نے محکوم یا مرعوب مُسلم ممالک کو جو اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں دیں ان سے نکلے ہوئے مسلمانوں کے لئے، اگر انھیں اسلام سے متعلق کچھ جاننے کا شوق ہوتا، تو بھی کسی یوروپی زبان میں لکھا گیا لٹریچر ہوتا، افسوس تو اس کا ہے کہ مقامی زبانوں میں لکھنے والے مُسلم مصنفین بھی زیادہ تر ایسی کتابیں یا مضامین لکھتے جن میں مرعوبیت نمایاں ہوتی، نقالی ہوتی یا اعتذار کا پہلو غالب ہوتا۔ مدرسے اور خانقاہیں جہاں قدیم کتابوں کا چرچا ہوتا، وہ اس یلغار کے سامنے اپنے آپ کو سخت کمزوری اور بے بسی کی حد تک دفاعی موقف میں پاتی تھیں اور نئی نسل ان کی طرف نگاہ غلط انداز بھی ڈالنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اسلام خود اپنے ہی وطن میں غریب الوطن تھا۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس صدی میں سیاسی محاذ پر بھی اور تہذیبی و مذہبی محاذ پر بھی، جن زعمائے اسلام نے طوفانِ مغرب کا مقابلہ کیا ان کی بڑی تعداد انھیں بوریہ نشینوں پر مشتمل تھی جنھوں نے مکتب و مدرسے کی چٹائیوں پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کی تھی۔ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک کم وبیش ہر ملک میں یہی جماعت مغرب کے سیاسی و تہذیبی استعمار کا مقابلہ کرتی نظر آئے گی۔ یہی گدایان عشق تھے جنھوں نے محکوم مسلمانوں کو آئینہ ایام میں ان کی شاندار تاریخ اور ان کے عظیم الشان کارناموں کی تصویر دکھائی اور یہی وہ شاہانِ بے کلہ تھے جنھوں نے سیاسی غلامی اور تہذیبی مرعوبیت و محکومی کے تاریک دور میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد رکھی۔ صنعتی انقلاب کے بعد مغربی تہذیب جس شان و شوکت اور جس جاہ و حشم کے ساتھ بڑھی اور پھیلی اور جس قوت اور توانائی کے ساتھ اسلامی دنیا پر چھا گئی، اسلامی تہذیب کے علاوہ کوئی اور

ساری دنیائے اسلام کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ واقعہ ہر لحاظ سے عبرتناک ہے۔ مسلمانوں میں ارباب بصیرت یقیناً ہوں گے۔ انھیں چاہیئے کہ اس المناک واقعہ کی تہوں تک پہونچیں اور یہ کہہ کر مطمئن نہ ہو جائیں کہ

راز خدائی ہے یہ، کہہ نہیں سکتی زباں

دوسرا افسوسناک واقعہ یہ ہوا کہ افغانستان میں روس کی فوج داخل ہو گئی جہاں غیور پٹھان اپنے ملک اور اپنے عقیدہ کی آزادی کے لئے جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ یہ واقعہ بھی اپنے مضمرات کے لحاظ سے نہایت اہم ہے، اس نے اسلامی دنیا کو ایک بڑے پیچیدہ بحران میں مبتلا کر دیا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہم اس بات پر خوش ہوتے اگر دنیائے اسلام کی اسلامی تحریکیں روح مسلماں کے اضطراب کی سچی ترجمان ہوتیں اور ان سے بندۂ مومن کا راز، اس کے دنوں کی تپش اور اس کی شبوں کا گداز، اس کا مقام بلند اور اس کا خیال عظیم —— یہ سب کچھ آشکار ہوتا اور یہ تحریکیں اللہ کا ہاتھ بن جاتیں اور مسلمان آج کی اس دکھ بھری دنیا میں اس قابل بن جاتے کہ خیر امت کا قرآنی لقب ان پر صادق آتا۔ اب تک ان تحریکوں کے سلسلے میں جو کچھ سامنے آیا ہے وہ کچھ امید افزا نہیں ہے۔ ایران میں 'اسلامی انقلاب' ہوا تو مسلمانوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور یہ امید بندھی کہ ایران جس کا ذہن روایتی طور پر تجزیاتی ہے، کتاب و سنت کی روشنی میں اسلامی نظام کی کوئی ایسی تعبیر پیش کرے گا جس سے قدیم اور جدید دونوں کے تقاضے اس خوشگوار ہم آہنگی کے ساتھ پورے ہوں گے کہ مغرب اور مشرق، شمال اور جنوب سبھی کو اپنے درد کا مداوا مل جائے گا۔ لیکن اب تک کی اطلاعات و معلومات کے پیش نظر ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی، ایران کے مذہبی رہنماؤں کی تقریریں سنئے یا تحریریں پڑھئے تو مغرب کے خلاف ایک جذباتی ردعمل کے سوا اور کچھ نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا پندرہویں صدی ہجری کا استقبال اسلامی دنیا اس عزم کے ساتھ نہیں کر سکتی کہ وہ اسلامی بیداری کی اُس لہر کو جو آج پائی جاتی ہے اور جس کے پیچھے چودہویں صدی کے زعمائے اسلام کی عملی کوششوں اور فکری کاوشوں کی شاندار روایات ہیں، ضائع نہ ہونے دیں گے اور اسے فکر و عمل کی ایک ایسی جہت کی طرف لے جائیں گے جہاں یہ بڑھتے

بڑے سے بڑے حصہ پر اسی ایک کا اثر قائم ہو جائے ۔ ظاہر ہے کہ ان دو بڑی طاقتوں کی اس کشمکش میں وہ مسلم ممالک جو ابھی ابھی غیروں کی غلامی یا بالادستی سے آزاد ہوئے تھے اور جنھیں ابھی اپنی روحانی و اخلاقی میراث کو از سرِ نو ترتیب دے کر مستحکم کرنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا، اپنی ہی سیاسی ہنگامہ آرائیوں میں مبتلا ہو گئے ۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران مغرب نے اسلامی دنیا اور خاص طور پر عرب دنیا کی پیٹھ میں بالفور اعلان کی شکل میں جو خنجر بھونکا تھا، وہ دوسری جنگ عظیم کے بعد اسرائیل کی صورت میں زہر میں بجھی تلوار بن کر سامنے آیا اور اس کا رخون آشامی میں روس اور امریکہ دونوں برابر کے شریک رہے ۔ اسرائیل کے قیام نے عرب دنیا کو ایک نئی آزمائش میں مبتلا کر دیا، اور یہ آزمائش ابھی باقی اور جاری ہے ۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ حقیقت بھی ظاہر ہوئی کہ دنیائے اسلام کا ایک بڑا حصہ قدرتی وسائل سے مالامال ہے، خاص طور پر پٹرول کا بہت بڑا ذخیرہ اس کے پاس ہے ۔ رفتہ رفتہ یہ بات بھی واشگاف ہوئی کہ پٹرول یعنی تیل ایک ایسی قوت ہے، جو دنیا کی سیاست پر بڑا گہرا اثر ڈال سکتی ہے، اور اس کا خطرہ بھی محسوس کیا جانے لگا کہ نہ صرف تیل کا ذخیرہ رکھنے والے ملک جنگ کی تباہ کاریوں کا شکار ہو سکتے ہیں بلکہ پوری دنیا ایٹمی دھماکے کی زد میں ہے ۔ تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں دولت بھی بے پناہ آئی جس سے ان ملکوں کا معیارِ زندگی اونچا ہوا اور ایک بڑے طبقہ میں خوشحالی پھیلی ۔ لیکن ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھئے تو ان ملکوں میں دولت کی فراوانی ایک عذاب بنتی جا رہی ہے کیونکہ اس کا فائدہ صحیح معنوں میں مغرب ہی کو پہونچا ہے اور کثیر مقدار میں درآمد کی ہوئی چیزوں کے ساتھ جن میں ضروریات سے زیادہ تعیشات ہوتی ہیں ، فوجی، اقتصادی اور تکنیکی ماہرین اور مشیروں کے جلو میں مغربی تہذیب کے اثرات حکمراں طبقے اور دولتمندوں اور خوشحالوں کے نئے طبقے سبھی پر پڑ رہے ہیں اور ان ملکوں میں نظام معیشت اسلامی اصولوں سے بہت دور جا پڑا ہے ۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ کیا تقدیر نے اسی دن کے لئے تنکے چنوائے تھے کہ جب نشیمن بن کر تیار ہو جائے تو کوئی آئے اور اس میں آگ لگا دے ۔

چودھویں صدی اپنے اختتام کی دہلیز پر پہونچی تو خانۂ کعبہ کی تقدیس مجروح ہوئی جس نے

# اسلام اور مغرب
## (عہد وسطیٰ میں)

عہد وسطیٰ میں اسلام اور مغرب کے تعلقات کی تشکیل میں کون کون سے خاص عوامل کارفرما تھے۔ ان سے مختلف صدیوں میں تعلقات کی نوعیت کس طرح متاثر ہوتی رہی اور پھر مغرب کے تہذیبی ارتقا میں مجموعی طور پر اسلام کا کیا رول تھا، ہمارے مورخوں اور عالموں نے ابھی اس موضوع پر کوئی بالاستعیاب مطالعہ نہیں پیش کیا ہے۔ سائنس، فلسفہ، شعر و ادب، آرٹ اور فن تعمیر وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن پر اسلامی تہذیب کے اثرات کے بعض اچھے مطالعے مل جاتے ہیں، لیکن عہد وسطیٰ کے مغرب کے طرز فکر، تہذیب و ثقافت، مذہبی اصلاحات اور سیاسی انقلابات کے پیچھے اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کی فکری کاوشوں اور علمی کارناموں کے کیا اثرات کارفرما رہے ہیں، ابھی اس کا بھرپور جائزہ نہیں لیا گیا ہے۔ یہ جائزہ مکمل ہو جائے تو ہم یہ کہہ سکیں گے کہ جدید مغربی تہذیب کے ارتقا میں، جو اب عالمی تہذیب بن گئی ہے اسلام کا کیا اور کتنا حصہ رہا ہے۔ ابھی پورے ایک سو سال بھی نہیں گذرے کہ صورت حال یہ تھی کہ یورپ اور امریکہ کے اسکالرز اسلام سے متعلق جو کہتے تھے اس میں بہت کچھ تعصب اور جانبداری ہوتی تھی، مغرب میں آج بھی جبکہ اسلام کا مطالعہ بڑی حد تک معروضی نقطۂ نظر سے کیا جارہا ہے، کم لوگ ایسے ہیں جو اپنے تہذیبی ورثے میں اسلام کے اثر کی کمیت، کیفیت اور اہمیت کا اعتراف کرتے ہوں۔ عام طور پر اس بات کو نظرانداز کردیا جاتا ہے یا اسے وہ حیثیت

بڑھتے وہ عالم نو بن جائے گی جو آج پردۂ تقدیر میں سویا ہوا ہے، یہ عالم نو اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا نقطۂ عروج ہوگا۔ مغرب اور مشرق ہر طرف سے ایک چیلنج ہے۔ عالمی سیاست بڑی پیچیدہ ہو گئی ہے اور اس نے دنیا کو ایک ایسے مقام پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں مکمل تباہی و بربادی ہے، مغربی تہذیب جس کی ایک شکل اشتراکی تہذیب بھی ہے، اخلاقی اعتبار سے دم توڑ رہی ہے، ایسے میں دنیا کے تمام مسلمانوں کا جو قرآنی اعلان کے مطابق خدا کے عالمگیر پیغام کے مبلغ ہیں، یہ فرض ہے کہ وہ مغربی تہذیب اور اشتراکی تہذیب دونوں کا گہرا مطالعہ کرکے یہ معلوم کریں کہ ان کی بیماریاں کیا ہیں کیونکہ یہ بیماریاں اب پورے عالم انسانیت کو لاحق ہوتی جا رہی ہیں، اور پھر یہ دیکھیں کہ ان بیماریوں کے کیا اسباب ہیں، یہ پتہ لگ جائے تو ہمارا یقین ہے کہ قرآنی تعلیمات کی صورت میں ان کے پاس جو نسخۂ کیمیا ہے اُس سے نہ صرف ان بیماریوں کی روک تھام اور علاج کی تدبیریں معلوم ہو جائیں گی بلکہ ان سے کام لے کر وہ اپنی اصلاح کے ساتھ ساتھ ساری نوعِ انسانی کی اصلاح کا وہ پیغمبرانہ کام انجام دیں گے جو قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی امتیازی شان تھی۔

جنوری ۱۹۸۰ء

کا تسلط قائم ہو گیا جس میں ان کی اجازت کے بغیر کسی دوسری قوم کے جہاز آزادی سے نہیں چل سکتے تھے۔

یوں تو یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے خلافت راشدہ ہی کے زمانے سے لیکن اسے تقویت اور توسیع ملی عہد بنی امیہ میں۔ جہاز سازی اور جہاز رانی کے فن سے جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصے کے لوگ خوب واقف تھے اور ظہور اسلام سے بہت پہلے بحیرۂ احمر اور بحر ہند میں ان کے جہاز دوڑتے تھے۔ اب شمال کے عرب بھی نہ صرف اس فن سے واقف ہو گئے بلکہ جلد ہی انھوں نے ایک مضبوط بحری بیڑہ تیار کر کے بحیرۂ روم اور اس کے ساحلی علاقوں میں فتوحات اور تجارتی پھیلاؤ کا ایک وسیع سلسلہ شروع کر دیا۔ عربوں کو جہاز سازی کے فن میں تکنیکی مہارت کے لحاظ سے بھی فوقیت حاصل تھی۔ چینیوں سے ان کا رابطہ نہایت قدیم تھا اور انھیں سے انھوں نے اس فن کی باریکیاں سیکھی تھیں۔ عرب جہاز رانوں کے توسط سے عہد اسلامی میں مغرب بھی ان سے بہت کچھ آشنا ہوا اور رفتہ رفتہ اس کے محیر العقول نتائج سامنے آئے۔ یہیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ مسلمانوں نے اپنی سیاسی و تہذیبی عروج کے زمانے میں مشرق کے علوم و ثقافت اور فنی ایجادات اور تکنیکی مہارت کو مغرب میں پہونچایا۔ تاریخ تمدن میں اس قسم کے نقل و حمل کا فریضہ وہی قومیں انجام دیتی ہیں جو صدیوں جہاں گیری و جہانبانی کے ساتھ علم و تمدن، اخلاقی قوت و صلابت اور آداب و اقدار معاشرت کی شمعیں بھی روشن رکھتی ہیں، اور بلا شبہ اس لحاظ سے تاریخ عالم میں مسلمانوں کے کارنامے اپنی مثال آپ ہیں۔

اسلام کی فوجی فتوحات، عربوں کی ثقافتی زندگی، عربی شعر و ادب، عرب تمدن جو شہری تمدن تھا، پھر عربوں کی طرز معاشرت —— یہ سب وہ چیزیں تھیں جو عہد وسطیٰ کی عیسائی دنیا کے لئے نمونہ بن گئیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ان چیزوں کا ایک اثر یہ بھی مرتب ہوا کہ مغرب ایک قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا جس کا مداوا اس نے آگے چل کر مذہب میں تلاش کیا۔ گیارہویں اور بارہویں صدی میں جہاں ہم یورپ کو عرب سائنس و فلسفے کی طرف راغب اور متوجہ پاتے ہیں، وہاں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان کا مذہبی احساس حمیت بیدار ہو رہا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کلیسا اور پاپائیت میں اصلاح کی کوشش بھی کی جاتی ہے جس کا مذہبی احساس کی اس بیداری

نہیں دی جاتی جس کی کہ یہ کسی رعایت کی بنا پر نہیں بلکہ تاریخی حقائق کی بنا پر مستحق ہے۔

عہد وسطیٰ میں مغرب پر اسلام کے اثرات کا مطالعہ کرتے وقت چند بنیادی باتیں پیش نظر رہیں تو حقائق کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ سب سے پہلے تو اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ اس زمان و مکان میں جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ مرہون منت ہے اُس خدائی قانون کا جسے ہم سبب اور نتیجہ کے ایک تسلسل کے نام سے جانتے ہیں، یہی قانونِ الٰہی نوع انسانی کی تمدنی زندگی میں بھی کارفرما رہا ہے۔ پھر اسی قانون کے تحت اقوام وملل کے ایام بدلتے رہتے ہیں، ایک تہذیب بنی، ایک تمدن طلوع ہوا، پھر کچھ عرصہ بعد وہ تہذیب اور وہ تمدن غروب ہو گیا، لیکن مٹتے مٹتے بھی یہ تمدن بہت کچھ چھوڑ گیا اور پھر اسی کے آثار پر نئے تمدن کی عمارت کھڑی ہوئی۔ اس طرح تاریخ انسانی کے سفر میں تہذیبیں اور تمدن ایک دوسرے پر اثر ڈالتے رہے ہیں۔ خود اسلامی تہذیب و تمدن کی تشکیل و ارتقاء میں کئی تہذیبی اثرات شامل تھے، لیکن چونکہ اس تہذیب و تمدن میں اسلام اور تعلیمات قرآنی کو محوری اور کلیدی حیثیت حاصل تھی، اسی لئے ہم اسے اسلامی تہذیب کہتے ہیں۔ مغرب چونکہ صدیوں اسلام اور ہر اُس چیز سے جس کا تعلق اسلام اور مسلمانوں سے تھا، گریزاں رہا، اس لئے اس نے اپنی اسلامی تہذیبی میراث کی طرف سے آنکھ بند کر کے یہ دعویٰ کیا کہ مغربی تمدن خالصتاً یونانی۔ رومی۔ عیسائی تمدن ہے۔ مغرب کا یہ رویہ سراسر متعصبانہ اور غیر منصفانہ تھا اور تاریخ عالم کی 'شریعت' میں ہم اسے کفر اور انکار سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

اسلامی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو مشرق قریب اور مشرقی بحیرۂ روم میں مسلمانوں کا سامنا بازنطینیوں سے ہوا جو درحقیقت یونانی۔ رومی۔ عیسائی تہذیبی روایت کے حامل تھے۔ پھر بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل کے ساتھ ساتھ مسلمان آگے بڑھتے گئے اور اسپین کے فاتح بن گئے جہاں اُس ترقی یافتہ تہذیب کا ظہور ہوا جو تاریخ میں ہسپانو عرب کلچر (HISPANO ARABIC CULTURE) کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ اسی دوران سسلی پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا، جنوبی اٹلی، روم اور شمالی اٹلی تک کے علاقے ان کے اثر میں آ گئے اور جنوبی فرانس کے ساحلی علاقے بھی متاثر ہوئے۔ اس طرح پورے بحیرۂ روم پر مسلمانوں

نقطۂ نظر سے یروشلم سب سے قیمتی شے تھی .لیکن ہمارا خیال ہے کہ صلیبی جنگوں کے قائدین
اور ان جنگوں کے اخراجات کا ایک حد تک بار اٹھانے والے اٹلی کے تجارتی شہروں کے دیوی
عزائم اور تجارتی حوصلوں اور امنگوں نے صلیبی جنگ کے تخیل کو زیادہ تقویت بخشی اور مذہبی
جذبے کی شدت اور حرارت کو اس کے لئے بڑی خوبی سے استعمال کیا گیا ۔ اس کے علاوہ اہل
مغرب پر یہ احساس بھی غالب اور محیط تھا کہ صدیوں سے بحیرۂ روم مسلمانوں کا سمندر بن کر
رہ گیا تھا جو عیسائی دنیا کے دشمن تھے اور اتنے قوی تھے کہ وہ اسپین سے لگے مصر و شام
تک ، ادھر مصر و شام سے مشرق اور جنوب کی طرف پھیلے ہوئے تھے اور ان تمام تجارتی
راستوں پر قابض تھے جو مغرب کو مشرق اور جنوب سے ملاتے تھے ۔اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا
کہ مغرب کی معاشی ترقی و خوشحالی کے امکانات بہت محدود اور فرانس اور اٹلی کے تاجر مسلمانوں
کے دست نگر ہو کر رہ گئے تھے ۔ جغرافیائی معلومات کی کمی کے سبب مغرب میں زیادہ تر لوگ
ایسے تھے جن پر یہ خوف بھی مسلط تھا کہ نصف سے زیادہ دنیا مسلمانوں کے قبضہ میں ہے اور
سیاسی فتوحات اور تہذیبی ترقی نے ان میں یہ اعتماد بھی پیدا کر دیا ہے کہ ان کا مذہب ہر لحاظ
سے افضل اور برتر ہے ۔

میدان جنگ میں مغرب کو شکست ہوئی اور سیاسی اعتبار سے بھی وہ خسارہ میں
رہا لیکن صلیبی جنگوں کے نتیجہ میں اس کو یہ فائدہ ضرور ہوا کہ اس میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی اور
اس نے اپنی ترقی کے لئے نئے محاذوں کی تلاش شروع کر دی ، اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ بھی
تھی کہ آگے چل کر اہل مغرب کی توجہ اس طرف مبذول ہوئی کہ اگر مغرب مصر، شام اور فلسطین سے
گذر کر مشرق میں نہیں پہونچ سکتا تو پھر جبکہ زمین گول ہے تو وہ مغرب کی طرف چل کر مشرق میں
پہونچ سکتا ہے ، چنانچہ نتیجہ میں نئی دنیا کی دریافت ہوئی اور اس سے پہلے راس امید (کیپ
آف گڈ ہوپ ) کا سراغ لگا جس سے گذر کر مغرب دنیائے اسلام پر عقب سے حملہ آور ہوا ۔
اس خیال میں بھی بڑا وزن ہے کہ اگر ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے مشرق کی
عیسائی دنیا کو ختم نہ کر دیا ہوتا تو شاید مغرب نشأۃ ثانیہ اور مذہبی اصلاح کی تحریکات کے بعد ایک
بار پھر مشرق کی راہ ہی سے اسلامی دنیا پر حملہ آور ہوتا ۔ ۱۴۵۳ء کے بعد سے نہر سویز کی تعمیر تک

میں بڑا حصہ تھا۔ نتیجہ کے اعتبار سے اس اصلاحی کوشش کے کئی پہلو سامنے آئے۔ اس سے کلیسا کی مرکزیت مضبوط اور مستحکم ہوئی۔ پاپائے روم کا اقتدار بڑھا، عیسائی ریاستیں اس کے اثر میں آئیں اور ان کے معاملات میں رومی کلیسا کی دخل اندازی تسلیم کرلی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ جب پاپائیت نے یہ خیال پیش کیا کہ عیسائی ریاستیں آپس میں لڑکر اپنی طاقت کمزور کرنے کے بجائے مل کر ان طاقتوں کے خلاف جنگ کریں جو اندرا اور باہر دونوں جانب سے مسیحیت اور مسیحی دنیا پر ضرب لگا رہی تھیں، تو اس خیال کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ صلیبی جنگوں کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے، بعد میں کچھ سیکولر مفاد بھی صلیبی جنگ کے تصور سے وابستہ ہوگئے جنھیں محمد اور شارلیمان کے مصنف نے بڑی خوبی اور معروضیت کے ساتھ بیان کیا ہے صلیبی جنگیں اپنے مقصد میں ناکام رہیں تو مغرب کو یقین ہوگیا کہ اسلامی مملکتیں مجموعی اعتبار سے کافی طاقتور ہیں اور اس کے فوجی و سیاسی قائدین اس نتیجے پر پہونچے کہ جب تک ایشیائے کوچک یا مصر پر ان کا اقتدار قائم نہ ہوگا وہ فلسطین اور شام میں اپنے قدم نہیں جما سکتے۔

اسپین اور سسلی ہو یا صلیبی جنگیں، عیسائیوں نے مسلمانوں کو رزم میں بھی دیکھا اور بزم میں بھی، اور ایک طویل عرصے تک دونوں میں، خواہ زمانہ جنگ ہو یا زمانہ امن، قریبی ربط ضبط رہا، لیکن اس کے باوجود یورپ میں اسلام کو ایک نہایت بھدی اور بگاڑی ہوئی شکل میں پیش کیا گیا اور اس وقت سے لے کر آج تک، اہل مغرب کا ذہن اس سے متاثر ہے۔

صلیبی جنگ کا تخیل کس طرح اہل مغرب کے دل و دماغ پر چھایا رہا، یہ بذات خود ایک دلچسپ اور حیرت انگیز داستان ہے، خاص طور پر اس لحاظ سے کہ کس قدر احمقانہ تخیل تھا یہ کہ لڑنے والوں کو اس علاقے کے حالات اور اپنے مقابل کی طاقت سے متعلق ضروری معلومات حاصل نہ تھیں اور اس کا اندازہ بھی نہ تھا کہ اتنی طویل سپلائی لائن کے خطرات اور نقل وحمل کے ذرائع کی کمی کیا تباہیاں لا سکتی ہے۔

ایک اہم سوال یہ بھی ہے کہ صلیبی جنگ کا تخیل، اگر اس سے مقصود عیسائیت دشمن طاقتوں سے لڑنا اور عیسائی دنیا کی سرحدیں بڑھانا تھا تو یہ جنگ مسلمانوں ہی کے خلاف کیوں لڑی گئی؟ آخر شمال مشرقی یورپ کی طرف توجہ کیوں نہیں کی گئی؟ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہوگا کہ دینی

مسلمانوں کی وہ علمی وادبی کاوشیں بھی دور دور تک پھیلتی تھیں جن میں ان کی اپنی تخلیقات کو بھی بہت کچھ دخل تھا۔ اصل میں پندرہویں صدی کی یوروپی نشأۃ ثانیہ کا خمیر کوئی تین چار صدی پہلے سے تیار ہو رہا تھا اور اس کے آثار مغرب کے علمی مرکزوں میں رونما ہونے لگے تھے۔

اب آئیے دیکھیں کہ کیا یونانی سائنس اور فلسفہ خود اپنے طور پر مغرب کو آج کا مغرب بنا سکتے تھے؟ ہمارا خیال ہے کہ غالباً یہ ممکن نہ تھا۔ یونانی فکر، دوسرے قدیم اور عظیم فکری نظاموں کی طرح عام طور پر فکر مجرد تھا اور عملی زندگی کے احوال محض فکر مجرد کی مدد سے قابو میں نہیں لائے جا سکتے۔ عملی زندگی میں مشاہدات باطن کا جو رول ہے اس سے یہاں بحث نہیں، اب رہے عالم فطرت اور عالم تاریخ تو ان پر قرآن نے بار بار توجہ اور تدبر کی تلقین کی ہے۔ قرآن ہی کی تعلیم سے رفتہ رفتہ جب مسلمان اس حقیقت کو پا گئے کہ کائنات میں حرکت ہے اور وہ متناہی ہے تو پھر انھیں یونانی فلسفے کی خامیوں کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی اور انھوں نے فکر یونان کے نظری پہلوؤں سے بغاوت کر دی۔ یہ ساری کائنات۔ یہ عالم فطرت انسان کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے اور عالم فطرت اور عالم تاریخ ہی علوم انسانی کا سرچشمہ ہے، محسوس اور ٹھوس حقائق کو جن سے اس دنیا کی ساری آب وتاب ہے، سمجھنے اور ان سے نتائج اخذ کرنے کے لئے مسلمانوں نے سائنس اور علوم کے ہر شعبہ میں تجربی منہاج اپنایا اور اطلاقی سائنس کی بنیاد رکھی جس کے نتیجہ میں ٹیکنولوجی کے میدان میں حیرتناک ترقیاں ہوئیں۔ فلکیات، ریاضی، طبیعیات، علم الکیمیا، طب، زراعت، غرض ہر صیغۂ علم میں تجربی طریقۂ کار اپنا کر انھوں نے اس دنیا کی مادی خوشحالی کے بے پناہ امکانات پیدا کر دیئے۔ یہی وجہ ہے کہ راجر بیکن کہا کرتا تھا کہ اگر اس کے معاصرین کو سچے علم کی تلاش ہے تو انھیں چاہیئے کہ عربی زبان اور عربی علوم کی تحصیل کریں۔ اہل مغرب راجر بیکن کو تجربی منہاج کا بانی کہتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خود اس نے عربوں سے ہی اسے سیکھا تھا۔ سب سے بڑی خدمت جو عربی تہذیب وثقافت نے کی وہ سائنس ہے۔" دنیائے قدیم کو جیسا ہمیں معلوم ہے عہد قبل سائنس کی دنیا تصور کرنا چاہیئے۔ اہل یونان کے یہاں فلکیات اور ریاضی کی حیثیت ایک باہر سے لائی ہوئی چیز کی تھی جسے یونانی تہذیب وتمدن نے ہمیشہ اجنبیت اور مغائرت کی نظر سے دیکھا۔ یونانی خیالات میں نظم وترتیب پیدا کرتے، تعمیمات اور نظریوں

ترک تقریباً چار سو برس تک مغرب کی راہ روکے کھڑے رہے اور جب پہلی جنگ عظیم کے دوران شام اور فلسطین کے محاذ پر ترک پسپا ہو گئے اور انگریز جنرل یروشلم میں فاتحانہ داخل ہوا تو اس نے کہا کہ صلیبی جنگیں آج ختم ہوئی ہیں۔ اس انگریز جنرل کی یہ بات تاریخی اعتبار سے بڑی معنی خیز تھی۔

عہد وسطیٰ میں اسلام اور مغرب کا جو آمنا سامنا ہوا اس کے تمام پہلوؤں کو اگر ایک ساتھ نظر میں رکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ منفی اور مثبت، دونوں لحاظ سے، مغرب اسلام کا بہت زیادہ مرہون منت ہے۔ زراعت وصنعت اور ٹیکنولوجی کے شعبوں کی ترقی ہو یا سائنس و فلسفہ ہو یا وہ علمی نقطۂ نظر ہو جس پر آج مغرب کو ناز ہے۔ ان تمام امور میں صدیوں اسلام نے مغرب کی رہنمائی کی ہے اور اسے اب قدرے شرماشرما کر مگر صاف صاف تسلیم کیا جانے لگا ہے۔ لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ مسلمانوں کے علمی و فکری کارناموں کو یکسر نظر انداز کر کے یونان ہی کو مرکز علم و فن تصور کیا جاتا تھا۔ مغرب میں یہ ذہنی رویہ پروان چڑھا تامس اکوائنس کے پیروؤں کے غیر متوازن رجحان سے۔ خود اکوائنس جس نے سائنس، فلسفہ اور دینی عقائد کی خوشگوار آمیزش سے ایک مربوط دینی نظام فکر کی تشکیل کی کوشش کی، ارسطوئی فکریات کی توسیع کے سلسلے میں عربوں کی خدمات کا اعتراف کرتا تھا، لیکن بعد میں اُس کے مکتب خیال کے لوگوں نے عربوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ مغربی فکر نے ارسطو کو یوروپ کی علمی روایات کا ایک بنیادی جزو کہہ کر اور صدیوں کی خلیج پھاند کر براہ راست یونان سے اپنا تعلق پیدا کر لیا۔ کیسی ناانصافی اور علمی بددیانتی تھی اس ذہنی رویے میں!

کیا یونانی علوم کی نشأۃ ثانیہ ہی دراصل یوروپ کی نشأۃ ثانیہ تھی یا اس کے پیچھے کچھ دوسرے عوامل بھی تھے؟ کہا جاتا ہے کہ جب سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کیا اور پھر اس کے بعد یونان بھی فتح ہوا تو یونانی عالم اپنے اپنے کتب خانے لے کر اٹلی چلے گئے جہاں ان کے علوم کو نئی زندگی ملی اور یوروپ بھی عہد وسطیٰ کی تاریک صدیوں سے باہر نکل آیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یوروپ کو روشنی ملی اُن علمی وتہذیبی مراکز سے جو اسپین اور سسلی میں مسلمانوں نے قائم کئے تھے اور جہاں عربی زبان میں ارسطو اور یونانی عالموں کی کتابوں کے ترجمے ہی نہیں پڑھے پڑھائے جاتے تھے بلکہ جہاں سے

# اسلامی فنڈامنٹل ازم

ادھر دو تین سال سے امریکہ اور یورپ اور ان کی پیروی میں ہندوستان اور ایشیا کے دوسرے ملکوں کے اخبارات اور جرائد میں اسلامی فنڈامنٹل ازم (ISLAMIC FUNDAMENTALISM) کی اصطلاح کا ذکر بہت ہوتا ہے اور اس ذکر سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسلامی نظام کا تخیل عصر حاضر کے تقاضوں کے عین منافی ہے اور اس تخیل کے حاملین رجعت پرست اور ظلمت پسند ہیں۔ فنڈامنٹل ازم کی اصطلاح عیسائی دنیا کی دین ہے، مغرب اور خاص طور پر امریکہ کے عیسائیوں میں ایک طبقہ ایسا رہا ہے جو جدید عقائد کے خلاف آواز اٹھاتا ہے اور اس دیرینہ عقائد پر قائم رہنے کا حامی رہا ہے کہ انجیل کی صحت ناقابل انکار ہے۔ یہ طبقہ اس بات کا بھی حامی ہے کہ لفظاً لفظاً مذہب کے اصولوں کو لفظی معنوں میں قبول کیا جائے۔ یہاں اس سے بحث نہیں کہ عیسائی دنیا میں خود انجیل کی صحت اور عدم صحت سے متعلق کیا کیا بحثیں اٹھتی رہی ہیں اور آج کتنے عالم اور کتنے عیسائی انجیل کے الہامی تقدس سے متعلق شک و شبہ میں پڑ گئے ہیں۔ عیسائی مذہب کی اس مقدس کتاب کے بارے میں کئی جدید نظریے سامنے آئے ہیں جن کی تعبیرات و تشریحات نے عیسائی دنیا کو ایک ایسے خلا میں لا کھڑا کیا ہے کہ اس کی اخلاقی اور روحانی بنیادیں ہل گئی ہے۔ ایسے میں جب کبھی کوئی ایسی آواز اٹھتی

سے کام لیتے لیکن یہ امر کہ صبر اور محنت سے تحقیق و تدقیق کی طرف قدم اٹھائیں، یہ دیکھیں کہ انسانی اور قطعی علم بہ دیر اور آہستہ آہستہ تھوڑا تھوڑا کر کے جمع ہوتا ہے۔ سائنس کے منہاجات بڑے نازک اور دقیق ہیں، مشاہدات میں ایک ایک چیز پر مسلسل اور مستقلاً نظر رکھنا پڑتی ہے، یہ سب باتیں یونانی مزاج کے خلاف تھیں۔ بجز ایک استثنا، یعنی اسکندریہ کے کہ یہی ایک مقام تھا جہاں قدیم کلاسیکی دنیا نے سائنس کا مطالعہ صحیح زاویہ نظر سے کیا۔ لہٰذا جسے ہم سائنس کہتے ہیں یورپ میں اس کا ظہور تفتیش اور تحقیق کی جس نئی روح کی بدولت ہوا وہ نتیجہ تھی اس کے نئے نئے منہاجات تحقیق، منہاج تجربی، مشاہدے، پیمائش اور ریاضی کی ایک ایسی شکل میں نشو و نما کا جس سے اہل یونان سرتاسر بے خبر تھے۔ یہ نئی روح اور نئے منہاجات یورپ میں پھیلے تو عربوں ہی کے ذریعہ۔

اس طرح مسلمانوں میں منہاج تجربی وضع ہوا تو حکمت یونان سے کسی مفاہمت کی بنا پر نہیں بلکہ اس سے مسلسل ذہنی تصادم اور کشاکش کے بعد۔ یہی وہ حقیقت تھی جسے مغرب کے مذہبی مفکرین اور سیکولر ارباب فکر اور اہل قلم محض تعصب اور جانبداری کی بنا پر صدیوں تسلیم کرنے سے گریز کرتے رہے۔

اپریل ۱۹۸۰ء

حال کی اس نیرنگی نے بڑے الجھاوے پیدا کر دیئے ہیں اور دین اسلام کی تفہیم و تعبیر سیاسی عزائم کا شکار ہو کر رہ گئی ہے۔

شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا

اسلام ایک دین ہے اور قرآن کتاب ہدایت، پیغمبر اسلامؐ کا اصل مقصد تعلیمات قرآنی کے مطابق انسانوں کی اخلاقی اصلاح اور روحانی ترقی تھا اور آپؐ کی عمر بھر کی محنت اور جد و جہد سے جو نمونے کا معاشرہ وجود میں آیا اس کی امتیازی شان اس کا اخلاقی اور روحانی مقام ہی تھا، یہی مقام بلند وہ محور تھا جس کے گرد اس مثالی معاشرہ کے روزمرہ کے معمولات و حالات گردش کرتے تھے۔ معیشت کا کوئی گوشہ ہو یا زندگی کا کوئی شعبہ، سب میں اولیت و بالادستی اخلاقی و روحانی پہلو ہی کو حاصل تھی۔ لیکن کیسی عجیب بات ہے کہ آج جو مسلم ملک اور اسلامی تحریکیں قرآن اور سنت کی طرف مسلمانوں کو اپنی بلند آواز سے بلاتی ہیں اور قرن اول کی طرف مراجعت کی دعوت دیتی ہیں، ان کے حکمراں طبقہ اور قائدین کی زندگیوں کو دیکھئے تو دور دور تک ہمیں تضاد ہی تضاد ملتا ہے، ان کی معاشرت و معیشت کے ہر گوشے میں اس اخلاقی و روحانی معیار کا فقدان ہے جو قرآن کریم اور اسوۂ رسولؐ کا اصل اصول ہے۔ ہمیں تو کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلام کی جگ ہنسائی اس کے ان ماننے والوں کے ہاتھوں جو اس کا نام بہت زور سے لیتے ہیں، جیسی آج ہو رہی ہے ویسی شاید پہلے کبھی نہ ہوئی ہو۔

عقیدۂ توحید کے ساتھ ساتھ اسلام میں وحی الٰہی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور یہی وہ اساس ہے جس پر اسلامی ایمانیات کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ وحی وہ واسطہ ہے جس کے ذریعہ بندے کا خدا سے تعلق قائم ہوتا ہے اور وہ زندگی کی تعمیر و ارتقاء میں مشیت الٰہی کا ترجمان بن جاتا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک ایسا کہنا گستاخی ہوگی۔ لیکن غور سے دیکھئے تو یہ خالص اسلامی حقیقت ہے اس لئے کہ یہ ترجمانی اتنی ہی بامعنی اور نتیجہ خیز ہوگی جتنی کہ خدا سے بندہ کی قربت اور وحی الٰہی یا دوسرے لفظوں میں قرآن عزیز کی گہرائیوں میں جو اللہ کا کلام ہے، بندہ کی نظر ہوگی۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام وحی الٰہی کے امانت دار تھے

ہے کہ عیسائی دنیا کو اخلاقی و روحانی قوت اگر مل سکتی ہے تو صرف اسی طرح کہ وہ انجیل مقدس کو مضبوطی سے پکڑ لے اور اس کے اصل اصول کو اپنا معیارِ فکر و عمل قرار دے، تو ایسی آواز اور ایسے خیال کو فنڈامنٹل ازم کہہ کر اس پر ظلمت پسندی کی مہر لگا دی جاتی ہے۔ اور اب کچھ عرصہ سے بعض مسلم ممالک کی ان تحریکوں پر بھی یہی لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے جو مسلمانوں کو اسلام کے اصل اصول کی طرف دعوت دیتی ہیں۔

جہاں تک سچے اور کھرے اسلام کی طرف مسلمانوں کو دعوت دینے کا تعلق ہے، اس سے ہم آیندہ بحث کریں گے۔ اس سے پہلے ہمیں یہ کہنا ہے کہ مسلمانوں میں قرآن کریم کی صحت اور عدم صحت سے متعلق کبھی کوئی اختلاف نہیں پیدا ہوا۔ جدید اصول تحقیق کی آڑ لے کر بعض سامراجی مستشرقین نے یہ فتنہ پھیلانا چاہا اور اسلامی دنیا کے جدید طرز کے دانشوروں کے ایک محدود حلقے میں اس کا تھوڑا بہت اثر بھی ہوا۔ لیکن اس حلقے کو مسلمانوں میں کبھی معتبر نہیں سمجھا گیا اور ان کے سوادِ اعظم کے عقیدہ کی پختگی نے اس اثر کو بہت جلد زائل کر دیا۔ اس لئے جہاں تک قرآن عزیز کا تعلق ہے، اب تو عیسائی عالم بھی اس کی صحت سے انکار نہیں کرتے، اور اگر ان میں سے کسی کے دل میں کوئی شبہ ہے بھی تو اس خوف سے اس کا اظہار نہیں ہوتا کہ ان کے اپنے ہی لسانیاتی و تاریخی تنقید کے اصول اس سلسلے میں ان کا ساتھ نہیں دیتے۔ یہ اس دور میں جب کہ علم و تحقیق کے میدان میں بہت ترقی ہو چکی ہے، ایک دوسری صورت میں، قرآن کے اعجاز اور اس کے وحی الٰہی ہونے کا کھرا پورا اثبات ہے۔

اسلامی فنڈامنٹل ازم کی اصطلاح یوں تو مغرب کے سیاسی حالات و معاشی عزائم کے پس منظر میں ابھری ہے، لیکن ایک حد تک وہ مسلم ملک اور وہ اسلامی تحریکیں بھی اس کی ذمہ دار ہیں جو اپنے سیاسی و معاشی مفاد کے لئے اسلام کو ایک سیاسی تحریک کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ اسلام کبھی بھی اس لحاظ سے ایک سیاسی تحریک نہیں تھا اور نہ تو صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ نے اور نہ بعد کے ہمارے اسلاف نے اس طرح اسے سمجھا اور پیش کیا، جیسے کہ آج کی اصطلاح میں تحریکیں سمجھی اور پیش کی جاتی ہیں۔ صورت

کی دنیا سے ہو یا داخل کی دنیا سے، ہر کہیں ہو رہا ہے، اور دوسری طرف اِس دنیا کے احوال ہیں جن میں خدا کی شان ہر آن ایک نئے روپ میں ظاہر ہوتی رہتی ہے اور اس طرح یہ احوال بھی علم کا ایک ذریعہ ہیں، قرآن کی تعلیم یہی ہے کہ علم کے ان دونوں سرچشموں سے بیک وقت انسان کا تعلق باقی رہے۔

اب آئیے ایک خاص مسئلہ کو سامنے رکھ کر دیکھیں کہ سچے اور کھرے اسلام کی تعلیمات اس سلسلے میں کیا ہیں اور اس سے متعلق احوال وظروف کے کیا تقاضے ہیں اور فنڈامنٹل ازم کی حامی تحریکوں کا رویہ کیا ہے۔ یہ خاص مسئلہ معاشی نظام کا مسئلہ ہے، یعنی یہ کہ معیشت اجتماعی کے معاشی سیکٹر کی تنظیم اسلامی اصولوں کے مطابق کس نہج پہ ہونی چاہیئے۔ اس سلسلے میں یہ دیکھنا ہے کہ مسلم معاشروں میں عملی سطح پر معیشت میں درجات کے تفاوت پر کتنا زور دیا جاتا رہا ہے اور حق معیشت میں مساوات کے نظریے کو کتنی اہمیت دی گئی ہے، اور پھر خود اسلام کیا چاہتا ہے۔ ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ دنیائے اسلام میں کہیں بھی اسلامی تحریکیں جو بڑی بلند آہنگی سے اسلامی نظام کا نعرہ لگاتی ہیں، زندگی کے اس اہم مسئلہ کو ترجیحی حیثیت نہیں دیتیں۔ قرآن اور سنت کو مضبوطی سے پکڑنے کا شور تو بہت ہے لیکن اس شور میں اس اصل مسئلہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کہ معیشت اجتماعی میں قرآن کی تعلیم، نبیؐ کا اسوہ اور صحابہؓ کا فکر و عمل کیسے عدل و مساوات، کیسے توازن اور کیسی ہم آہنگی کا طالب ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

دنیا میں تفاوت درجات پر زور دینے والے ان آیات قرآنیہ کو بڑی مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور اپنے فکر و عمل کو خالص اسلامی فکر و عمل تصور کرتے ہیں۔

۱۔ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَٰتٍ

(دنیوی زندگی میں ہم نے لوگوں کی معیشت ان کے درمیان تقسیم کر دی ہے اور اس کو اس طرح کر دیا کہ بعض کو دوسرے بعض پر درجۂ معیشت میں بلندی حاصل ہے۔ (زخرف: ۳۲)

۲۔ اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ۔ (رعد: ۲۶)

(اللہ جس کے لئے چاہتا ہے رزق میں فراخی دیتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگی ڈالتا ہے)

اوران پر وحی کے ذریعہ جس طرح مشیت الٰہی منکشف ہوئی اور جس انداز پر وہ تاریخ انسانی کی تشکیل میں شریک ہوئے، وہ تاریخ عالم کا سنہرا باب ہے۔ ایک طرف تو انبیاء کا یہ عظیم الشان رول تھا اور دوسری طرف خدا کی بندگی میں وہ اس طرح ڈوبے رہتے تھے کہ اپنی راتیں جاگ کر گزارتے تھے اور اپنی مغفرت کی دعا کرتے تھے۔ خاص دعا ان کی یہ ہوتی تھی کہ منشائے الٰہی کو انسانوں تک پہونچانے میں اگر ان سے کوتاہی ہوئی ہو تو اللہ تعالیٰ انھیں معاف کر دے اور بخش دے۔

اس طرح اسلام میں نبوت کا جو تصور ہے اس کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ ہمارے بعض صوفی بزرگوں نے یہ بات اپنے اپنے انداز میں کہی ہے کہ محمد عربی اونچے سے اونچے آسمان کی بلندیوں تک پہونچے اور واپس تشریف لائے، اگر ہم اس مقام تک پہونچتے تو ہرگز واپس نہ آتے۔ اس بات میں جو نکتہ ہے وہ یہ ہے کہ نبی اس لئے دنیا میں واپس آتے تھے یا بھیجے جاتے تھے کہ وہ مشیت کے تخلیقی عمل کا ایک دنیوی واسطہ بن جائیں۔ یہ گوشت پوست کے انسان، بار امانت اٹھائے ہوئے، زمانے کی رو میں داخل ہو کر، انسانوں کی دنیا کی تعمیر نو کے لئے جب ظہور فرماتے تو اول اول لوگ انھیں اپنے ہی قبیلے کا ایک فرد تصور کرتے۔ لیکن چونکہ ان کا کام اصلاحی و تخلیقی ہوتا تھا، اس لئے جب وہ اپنی قوم کے رائج معتقدات اور فرسودہ رسم و رواج کے خلاف آواز اٹھاتے تھے تو ان کی مخالفت ان کے اپنے ہی لوگ کرتے تھے، انھیں اس کی خبر نہ تھی کہ وہ جن مصلحتوں اور قوتوں کے ساتھ اس دنیا میں آئے ہیں وہ غیبی مصلحتیں اور قوتیں ہیں اور ان کا ہاتھ درحقیقت اللہ کا ہاتھ ہے جو کارآفریں اور کارساز ہے۔ قرآنی آیت مَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ ... الخ کا یہی مفہوم ہے۔

اور پھر اسی کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن عزیز میں یہ جو عالم فطرت، عالم تاریخ اور انفس و آفاق میں تکرار کے ساتھ آیات الٰہیہ کے مشاہدے اور ان پر غور و فکر کی تعلیم دی گئی ہے تو اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اب جبکہ ختم نبوت کے ساتھ خدا اور بندے کے مابین وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے تو ایک تو علم کا سرچشمہ وہی وحی الٰہی ہے جو قرآن کی صورت میں ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ آیات الٰہی کا ظہور محسوسات و مدرکات میں، خواہ ان کا تعلق خارج

ہمارے مفسرین و محدثین نے کلام الٰہی کی تمام نصوص متعلقہ کو سامنے رکھا اور ان احادیث کو بھی جو حق معیشت کی مساوات کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ سورہ بقرہ کی مولہ بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے صاف صاف کہا ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں تمام بنی آدم کی مملوک معلوم ہوتی ہیں یعنی اشیاء کو پیدا کرنے سے مقصد خداوندی یہ ہے کہ تمام انسانوں کی ضرورتیں پوری ہوں۔ ہاں نزاع کو رفع کرنے اور زائد حاصل کرنے کے لئے قبضہ کو ملکیت کا سبب قرار دیا گیا۔ البتہ مالک کا یہ فرض ہے کہ وہ حاجت سے زائد پر قبضہ نہ رکھے بلکہ اس کو اوروں کے حوالے کر دے کیونکہ منشائے الٰہی کے مطابق دوسروں کے حقوق بھی اس میں ہیں۔ اس طرح اس سلسلے میں قرآنی تعلیم یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی ضرورت سے زیادہ رکھے تو اس کا شمار خیانت کرنے والوں میں ہوگا۔ مشہور حدیث ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جس شخص کے پاس قوت و طاقت کے سامان اپنی حاجت سے زائد ہوں اس کو چاہیئے کہ وہ اپنا فاضل سامان کمزور کو دیدے، اور جس کے پاس سامان خورد و نوش حاجت سے زائد ہو اس کو چاہیئے کہ فاضل سامان نادار و حاجتمند کو دیدے، نبی اکرمؐ اسی طرح مختلف اصنافِ مال کا ذکر فرماتے رہے یہاں تک کہ ہم نے یہ سمجھ لیا کہ ہم میں سے کسی شخص کو اپنے فاضل مال پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں ہے۔"

افسوس یہ ہے کہ آج ان اسلامی تعلیمات کو پیش کیجیے تو مسلمانوں کے اس طبقہ کو جو اسبابِ معیشت پر غاصبانہ اور خائنانہ طور پر قابض ہے۔ اشتراکیت و اشتمالیت کا شبہ ہونے لگتا ہے یا یہ کہ چونکہ وہ اپنے غیر اسلامی مفاد سے دستبردار ہونا نہیں چاہتا، اس لئے اس طرح کی بات کہنے والے کو اشتراکی کہہ کر خاموش کر دینے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ احکامات الٰہیہ اور ارشاداتِ نبویہ جس طرح آج مظلوم ہیں شاید کبھی نہ رہے ہوں۔ ملت اسلامی کی تاریخ کے ہر سخت مرحلے میں جب اسرارِ شریعت کے سمجھنے والے صاحب عزیمت علماء نے تجدید و اصلاح کی آواز بلند کی اور انھوں نے مسلم معاشرہ کا پوسٹ مارٹم کیا، تو سبھی نے دولت کی غلط تقسیم اور حق معیشت میں عدم مساوات کو وقت کا سب سے بڑا فساد کہا، ان علماء و مصلحین کے افکار و خیالات کے پیچھے جو سماجی و معاشی عوامل کارفرما تھے اگر ان کا مطالعہ و تجزیہ کیا جائے تو ان کی روشن ضمیری، فراست ایمانی اور بالغ نظری کا صحیح صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِیْ مَآ اٰتٰىكُمْ (انعام۔ ۱۶۵)

(اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور بعض کو بعض پر مرتبے دیئے تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے۔)

لیکن وہ قرآن کی اُن آیات یا اُن احادیث و روایات کو پڑھ کر گذر جاتے ہیں جن سے بغیر کسی تخصیص کے یہ ثابت ہے کہ رزق اور اسباب رزق، معیشت اور اسباب معیشت ایسی عالمگیر عطا و بخشش ہے جس سے فائدہ اٹھانے کا ہر جاندار کو حق ہے۔

۱۔ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ ط (نمل: ۶۴)

(اور آسمان اور زمین سے تم کو روزی کون پہنچاتا ہے کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے؟)

۲۔ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ۔ (حجر: ۲۰)

(اور ہم نے تمہارے واسطے اس میں (زمین میں) معیشت کے سامان بنائے اور ان کو بھی معاش دی جن کو تم روزی نہیں دیتے۔)

۳۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِيْعًا۔ (بقرہ۔ ۲۹)

(وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے تمہارے لئے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے۔)

۴۔ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِیْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ط سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ٥ (حٰم سجدہ : ۱۰)

(اور زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنائے اور اس میں برکت (فائدے کی چیزیں) رکھ دیں اور اس میں غذائیں تجویز کر دیں چار دن میں، جو برابر ہیں حاجت مندوں کے لئے۔)

۵۔ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِی الرِّزْقِ ج فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّیْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ط اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ٥ (نحل: ۷۱)

(اور اللہ تعالیٰ نے تم میں بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت دی ہے۔ (پھر ایسا نہیں ہوتا کہ) جن کو فضیلت دی گئی ہے وہ اپنی روزی کو اپنے زیر دستوں پر لوٹا دیں حالانکہ اس (روزی) میں وہ سب کے سب برابر کے حقدار ہیں۔ پھر کیا یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے صریح منکر نہیں ہو رہے ہیں۔)

# مسلمانوں کی اخلاقی حالت

عصرِ حاضر میں زندگی اتنی تیز رفتار ہے کہ اخلاقی اقدار بُری طرح پامال ہیں۔ ایسے میں اگر اس کا دامن پکڑ کر کوئی یہ کہے کہ "آہستہ خرام بلکہ مخرام زیرِ پایت ہزار جان است" تو ہر طرف سے صدا آتی ہے کہ یہ عہدِ جدید ہے۔ اس میں قرونِ وسطیٰ کی اخلاقیات کا راگ الاپنا بے وقت کی شہنائی ہے۔ اسے خاموش ہی رہنا چاہیئے۔ لیکن ہم بہرحال اس کے قائل نہیں کیونکہ اگر یہ نقطۂ نظر تسلیم کر لیا جائے تو پھر مذہب بھی عہدِ وسطیٰ کا ایک تصورِ محض بن کر رہ جائے گا۔ اسلام کے بارے میں تو یہ کہا ہی جاتا ہے کہ وہ عہدِ جدید کے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس نے قبائلی زندگی کے سماجی و معاشی ماحول میں جنم لیا تھا، اس کی سماجی و اخلاقی اقدار بھی قبائلی زندگی کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہیں۔ آج اس خلائی عہد میں ان اقدار کو اپنانے کا مطلب یہ ہوگا کہ انسان صدیوں پیچھے چلا جائے۔

ہمیں حیرت اُن لوگوں پر نہیں ہوتی جو کائنات سے متعلق الحادی نقطۂ نظر رکھتے ہیں یا نظریۂ ارتقا کے ماننے والے ہیں، حالانکہ اب سائنس کا رویہ بھی آفرینش کائنات سے متعلق بدلتا جا رہا ہے اور بڑے بڑے دیانتدار فلسفی سائنسداں بھی کائنات کی کہنہ کتاب کے پہلے اور آخری صفحے کے سلسلے میں تذبذب میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہمیں حیرت تو ان پر ہوتی ہے

لیکن آج صورت حال اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ آج کی اسلامی تحریکیں جو قرآن و سنت کی طرف مراجعت کی دعوت دیتی ہیں، وہ اپنے سیاسی و معاشی مصالح کے پیش نظر حق کو حق کہتے ہوئے ڈرتی ہیں، یا یہ کہ وہ اپنے موقف میں مخلص نہیں ہیں اور اس عالمی سیاست کا آلہ کار بن گئی ہیں جو دنیا کی دو بڑی نظریاتی، سیاسی اور فوجی طاقتوں کی کشاکش سے وابستہ ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ تحریکیں سب سے پہلے ان مسلم ممالک میں جہاں ان کی بات سنی جاتی ہے، قرآن و سنت کے مطابق دولت کی صحیح تقسیم اور اسباب معیشت میں انسانوں کے مساوی حقوق کی آواز بلند کرتیں، ان ملکوں کے اندر ارباب اقتدار و متمول طبقہ کو اسباب معیشت اور دولت کے بیجا اسراف سے روکتیں اور مسلم معاشرہ سے اس عدم مساوات کو دور کرنے میں لگ جاتیں جو معاشی عدم توازن سے پیدا ہوتی ہے اور اندر اندر گھن کی طرح معاشرہ کی اخلاقی و روحانی توانائی کو ختم کرتی رہتی ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ آج جس سیاسی، سماجی اور معاشی نظام میں قرآن و سنت کو مضبوطی سے پکڑنے کا آوازہ بلند کیا جا رہا ہے اس میں یہ ایک دل خوش کن آوازہ تو ہو سکتا ہے، لیکن اس سے کوئی مثبت اور مفید نتیجہ برآمد ہونے والا نہیں ہے۔ اسی معاشرہ میں اس قسم کی کوئی بات نتیجہ خیز ہو سکتی ہے جس میں خود اندر سے اس بات کو قبول کرنے کا داعیہ موجود ہو۔ اسلامی تحریکوں کو یہ نکتہ سمجھ لینا چاہیے کہ مسلم معاشروں کی اس وقت جو حالت ہے اور جس قسم کے اخلاقی، روحانی اور ایمانی بحران سے وہ گذر رہے ہیں اس میں مؤثر طریقہ کار یہی ہوگا کہ وہ پہلے اس کا جائزہ لیں کہ کیا واقعی ان معاشروں میں ذہنی و فکری و شعوری سطح نمودار ہوتی ہے کہ وہ تہذیب جدید کی چمک دمک کے پیچھے اس تہذیب کے بحران اور اس کے بنیادی اسباب کو دیکھ سکیں۔ اگر ایسا نہیں ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے تو پھر اسلام اسلام کہنے سے ان معاشروں میں کوئی بنیادی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ آج جب کہ صورت حال یہ ہے کہ بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندوی "مغرب نے (اور صحیح تر الفاظ میں یہودیت اور عیسائیت نے) اگر اسلام اور تمام دنیا کے مسلمانوں کا نہیں تو ان ممالک کا (جو کبھی دعوت اسلامی کا سرچشمہ تھے) قلعہ فتح کر لیا ہے اور اگر ان میں دینی ارتداد نہیں (جس کی مثالیں بھی بعض سربراہان مملکت، اور عرب دانشوروں کی تقریروں اور بیانات میں سامنے آتی رہتی ہیں) تو "ذہنی ارتداد" تو کم سے کم اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ میں پھیل رہا ہے"۔ تو پھر اسلامی تحریکوں کو دیانتداری کے ساتھ اپنا جائزہ لینا چاہیے اور مسلم حکومتوں کو بھی وقتی سیاسی منافع سے بالاتر ہو کر دیکھنا چاہیے کہ خود ان کے اپنے عمل سے ملت اسلامیہ کی کیسی بے آبروئی ہو رہی ہے اور خود اسلام پر کیا کیا گذر رہی ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن و سنت کو مضبوطی سے پکڑنے ہی میں نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی بلکہ تمام دنیا کی نجات ہے، لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ آج کے حالات میں ہم قرآن و سنت کو کیسے اور پہلے کس طرف سے پکڑیں؟ (اکتوبر سنہ ۱۹۸۰ء)

مسلمانوں کے چہروں پر اگر دیکھنے والی آنکھ ہوتی ، اور اُن کے سینوں میں اگر محسوس کرنے والے دل ہوتے تو وہ اپنے عقیدے اور عمل کا یہ تضاد صاف دیکھ سکتے اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو تمدن سے محسوس کر سکتے . مگر افسوس کہ آنکھیں ہیں مگر وہ دیکھ نہیں سکتے ، دل ہے مگر وہ محسوس نہیں کر سکتے . یہ کیسا انقلاب ہے اور کیسی زبوں حالی !

عام طور پر مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی زندگی میں عقیدے اور عمل کا یہ تضاد نظر آتا ہے . ہاں کچھ اللہ کے بندے ایسے ضرور ہیں جو کسی حد تک اس سے مستثنیٰ ہیں ، اور ایسے تو خال خال ہی ہوں گے جن کے یہاں عقیدے اور عمل میں کامل ہم آہنگی ہو . عام فضا وہی ہے جس کا ہم نے ذکر کیا اور یہ صورت فرد اور جماعت دونوں کی اخلاقی و روحانی زندگی کے لئے تباہ کن ہے . فرد کو لیجئے تو زندگی کے مادی فوائد حاصل کرنے میں وہ اس طرح دل وجان سے لگا ہوا ہے کہ نہ تو اُسے اس کا ہوش ہے کہ عزیزوں اور قرابت داروں کے کیا حقوق ہیں ، نہ اس کی فکر کہ پڑوسیوں ، مسکینوں ، یتیموں اور مسافروں سے متعلق اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں . مسجدوں میں نمازیوں کی تعداد بہت ملتی ہے جہاں وہ اپنے پیدا کرنے والے کے حضور میں کامل عبودیت و اطاعت کی تصویر نظر آتے ہیں ، لیکن مسجد سے باہر اپنے عمل سے اُسی خالق اور پالن ہار کے احکام سے روگردانی کرتے ملتے ہیں جس کے حضور میں ابھی چند ساعت پہلے وہ اپنی بندگی کا ثبوت دینے حاضر ہوئے تھے . غرض نمازی ہو یا غیر نمازی ، ہر شخص کے دل سے گویا نیکی کرنے کا خیال اٹھ گیا ہے ، کوئی کام نہیں جو خود غرضی سے خالی ہو ، قرابت داری اور دوستی کا کوئی پاس نہیں ، عزیزوں ، دوستوں اور ہم چشموں کی رسوائی پر خوشیاں منائی جاتی ہیں ، بھائیوں کی پریشانی سے دل خوش ہوتا ہے اور پڑوسیوں سے یا تو حسد کیا جاتا ہے یا ان کے دُکھ درد کی طرف سے آنکھیں بند رکھی جاتی ہیں ، مسکینوں کو نظر انداز کرتے ہیں اور یتیموں کا مال کھانے میں کوئی دریغ نہیں ، سائلوں کو دھتکارتے ہیں اور مسافروں اور مہمانوں کو ایک بوجھ سمجھتے ہیں . یہ سب نئے دور اور اس کی

جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور پھر اسلامی عقائد اور اسلام کے سماجی و اخلاقی اقدار کو ایک نظام کہنہ کی آواز بازگشت کا نام دیتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اسلامی عقائد و اقدار موجودہ زمانے کی ترقی کی دوڑ میں ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ہم ان کے اس ذہنی رویے اور فکری انتشار سے متفق نہیں ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اسلامی عقائد و اقدار سے زندگی میں حسن، توازن اور اعتدال پیدا ہوتا ہے اور یہی انسانیت کی جان ہے۔ یہ نہیں تو انسان خواہ وہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے، حیوان سے بدتر ہے۔ وہ ترقی بے معنی ہے جو انسان کو انسانیت سے عاری کر دے، زندگی کی وہ تیز رفتاری زندگی کی تباہی و بربادی ہے جو مروت، محبت اور صلہ رحمی کے جذبات کو فنا کر دے، وہ خلائی انسان انسانیت کے لئے ایک مصیبت اور بلا ہے جو انسان کے باطنی تقاضوں سے آشنا نہ ہو۔

لیکن آج وہ مسلمان بھی جو اپنی نمازوں میں یہ دعا مانگتے ہیں کہ "رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً" عام طور پر دنیا کی دولت ہی کمانے پر نظر رکھتے ہیں اور عملاً دعا کا یہی حصہ ان کے پیش نظر ہوتا ہے۔ غالباً ان کے اس ذہنی رویہ میں بھی موجودہ زمانے کی مادی ترقی کے تصور کا دخل ہے، اور وہ بھی ہمہ وقت اسی دنیا کو حاصل کرنے کی فکر میں مشغول ہیں۔ یہ بات ہم عوام میں بھی پاتے ہیں اور خواص میں بھی، ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے لوگوں میں بھی دیکھتے ہیں اور علماء اور دانشوروں کے طبقے میں بھی، مدرسوں میں بھی اور خانقاہوں میں بھی۔ اللہ اور آخرت پر ایمان مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے، زبان سے تو ہم اس کا اقرار کرتے ہیں، لیکن دل کی گہرائیوں میں شاید ہم اِس کو اترنے نہیں دیتے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا ذہنی رویہ اور ہمارے اعمال سب کے سب ہماری آخرت فراموشی کے غماز ہیں اور ہمیں اس کی فکر نہیں کہ ہم خدا کے سامنے جوابدہ ہیں، ورنہ ہمارے اعمال ایسے ضرور ہوتے جو ہمارے سفرِ آخرت میں زادِ راہ کا کام دیتے اور اپنی نمازوں میں جب ہم دعا مانگتے تو ہمارا مقصود دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی ہوتی۔

اور بعض اوقات شخصی عزائم کے تصادم کا شکار ہوئے اور اس سلسلے میں اسلامی اخلاق واقدار کا انھیں کچھ پاس نہ رہا۔ ان میں سے ہر ملک اسلام، کتاب اور سنت کا نام بڑے زور سے لیتا ہے۔ لیکن اپنی قومی انانیت اور اپنے اجتماعی غرور میں ایسا مبتلا ہے کہ عہد جاہلی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

ایران و عراق کی موجودہ جنگ ہی کی مثال لیجئے۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے کہ اسلام دشمن طاقتیں ہر طرف منہ کھولے کھڑی ہیں۔ یہ دونوں ملک جو مسلمان ہیں اور پڑوسی ہیں۔ محض اپنی انانیت اور اپنے سیاسی لیڈروں کے شخصی عزائم کی بدولت ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں اور سی احمقانہ جنگ لڑ رہے ہیں جس میں دونوں کا خسارہ اور دونوں کی ایسی تباہی ہے کہ اب ایک عرصہ تک ان کا سنبھلنا ناممکن اور قومی و صنعتی استحکام و ترقی کے میدان میں استعماری طاقتوں کا دست نگر رہنا ان کا مقدر ہے۔ ہمیں تو اس جنگ میں عہد جاہلی کے عرب قبائل کی اُن لڑائیوں کی خو بو محسوس ہوتی ہے جو اونٹوں کے بڑھنے بڑھانے اور پانی کے پینے پلانے پر ہوا کرتی تھیں اور برسوں چلا کرتی تھیں۔ ایران میں علماء بھی ہیں اور مجتہدین بھی، امراء بھی ہیں اور دانشور بھی، اسی طرح عراق میں عالم بھی ہیں اور مجتہد بھی، امیر بھی اور دانشور بھی، لیکن اس وقت سب کے سب قومی عصبیت و انانیت کے نشے میں چور نظر آتے ہیں اور اپنے اسی رویے کو اسلام کی سب سے بڑی خدمت تصور کرتے ہیں۔ گویا اجتماعی طور پر قوم کی قوم یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ وہ کوئی بڑا دینی فریضہ انجام دے رہی ہے جو فی سبیل اللہ ہے اور اُسے رضائے الٰہی حاصل ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض تنگ نظر اور متعصب حلقوں نے ایران اور عراق کی اِس برادر کشی کو عرب و عجم اور شیعہ سُنی جنگ بنا دیا ہے، حالانکہ اگر تہ میں اترئے اور مغرب سے لے کر مشرق تک مسلم حکومتوں اور حکمرانوں کو دیکھئے تو سب کے سب استعماری تہذیب و تمدن کو اس دور کی سب سے بڑی دین تصور

برق رفتار ترقی کی برکتیں ہیں۔

غریب اور اَن پڑھ مسلمانوں میں تو ممکن ہے کچھ نیک دل اور خدا ترس بھی مل جائیں لیکن عالموں اور دانشوروں، زاہدوں اور صوفیوں اور امیروں اور مترفوں کا حال تو نہایت ابتر ہے۔ علم و دانش، زہد و عبادت اور امیری و مرفہ الحالی کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان کے حاملین میں عجز، انکساری، محبت و رافت، سخاوت و فیاضی، حلم و مروت، اور خدا کی ممنونیت اور شکر گزاری کا جذبہ ہوتا۔ لیکن ہم اُن میں ان اخلاق حمیدہ کے بجائے تفاخر و حسد، رشک، ضد، جاہ پرستی، حبِ مال، فضول گوئی، قساوت قلبی خود غرضی اور خدا کی ناشکری زیادہ پاتے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کر رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی زبان، اپنے قلم، اپنے زہد، اپنی عبادت اپنی دولت کے ذریعے زیادہ سے زیادہ نام کمانا چاہتا ہے۔ ان میں سے ہر شخص حاکمانِ وقت اور حاملین اقتدار کی وظیفہ خواری کے لئے بے چین نظر آتا ہے۔ عجیب معاملہ ہے کہ اس دور میں غرور، جاہ پرستی حبِ مال اور ریاکاری جیسے اخلاقی امراض سب سے زیادہ عالموں، دانشوروں، صوفیوں اور خوشحال اور مطمئن لوگوں کے طبقے میں پائے جاتے ہیں۔ مسلم معاشرہ کی کیسی بھیانک تصویر ہے یہ!

اجتماعی سطح پر دیکھئے تو اس تصویر کے خطوط اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد مسلم دنیا میں استعماری طاقتیں کمزور ہونی شروع ہوئیں اور رفتہ رفتہ ایک ایک کر کے مسلمان ملکوں کو سیاسی آزادی ملی، اِدھر پٹرول کی دریافت کے بعد ان ملکوں میں بیداری کے آثار پیدا ہوئے۔ لیکن قومی سطح پر مسلم اقوام کو آزادی اور خوشحالی کی جو دولت میسر آئی اسے انھوں نے اپنے جماعتی اختلافات اور قومی منافسات پر بے دریغ خرچ کیا۔ غرض جو اخلاقی انحطاط شخصی سطح پر تھا وہ قومی و اجتماعی سطح پر اور بھی زیادہ خوفناک صورت میں ظاہر ہوا۔ استعماری طاقتوں کی معاشی و نظریاتی یلغار کے باوجود مسلم ممالک اپنے باہمی رشک و حسد، غرور و انانیت، خود غرضانہ قومی مفاد

ہیںکہ اتنے بڑے تاریخ ساز انقلاب کے پیچھے دنیوی اسباب میں سے صرف ایک سبب تھا جس نے ہوا کا رُخ بدل دیا اور وہ سبب یہ تھا کہ پے بہ پے فوجی شکستوں، شہروں اور آبادیوں کی مسلسل تباہی بے شمار انسانوں کے وحشت ناک قتل عام اور تہذیب و تمدن کی بے مثال تاخت و تاراج کے باوجود مسلمانوں کا اعتماد خدا پر قائم رہا، وہ اپنے عقیدے اور ایمان پر جمے رہے اور ان کی روحانی طاقت برقرار رہی، ایمانی ارتداد تو دور کی بات ہے ایک لمحہ کے لیے بھی ان میں نہ تو تہذیبی ارتداد اپنی جگہ بنا سکا اور نہ ذہنی ارتداد، اور ان سب چیزوں نے مل کر اجتماعی طور پر اُن کو اخلاقی انتشار میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس وقت جو لوگ مُسلم معاشرہ کا نمک تھے وہ خراب نہیں ہوئے، اور یہ وہ لوگ تھے جنھیں ہم اہلِ دل کہتے ہیں۔ ان میں امیر بھی تھے اور وزیر بھی، عالم بھی تھے اور صوفی بھی، عابد و زاہد بھی تھے اور واعظ بھی۔ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے اپنے فکر و عمل کی شمع اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشن رکھی اور اس کا نتیجہ یہ دیکھنے میں آیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے تاتاریوں کو من حیث القوم مسلمان بنا لیا۔ اس طرح مسلمان جس قوم کے ہاتھوں فوجی سطح پر شکست کھا چکے تھے، اور ایسی شکست کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب اسلام کے دن پورے ہو چکے۔ انھوں نے اسی قوم کو اپنی اخلاقی و روحانی قوت سے زیر کر لیا۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے نصف اول کی طویل مدت میں پہلے تو مسلمانوں کے سیاسی زوال کا آغاز ہوا اور پھر انھیں مغربی اقوام کے ہاتھوں ذلت و نکبت کا سامنا کرنا پڑا۔ سیاسی محکومی کے ساتھ ان کے ایک طبقے میں ذہنی محکومی بھی در آئی جو رفتہ رفتہ ذہنی و تہذیبی ارتداد میں مبتلا ہو گیا۔ خود مسلمانوں کا معاشرہ دو ایسے حصوں میں تقسیم ہو گیا جو فکری و عملی سطح پر ایک دوسرے سے متخالف و متصادم رہا۔ اس صورت حال نے معاشرہ کے دونوں حصوں میں اخلاقی و روحانی بحران کی کیفیت پیدا کر دی، گویا اِس بار مسلمانوں نے فوجی و سیاسی سطح پر شکست و ہزیمت کے ساتھ اخلاقی و روحانی سطح پر بھی مات کھائی، تاتاریوں کے حملے کے مقابلہ میں مغربی اقوام کے حملے کی نوعیت مختلف تھی، یہ بالکل

کرتے ہیں، اسی کے طرز زندگی کو اپنائے ہوئے ہیں، ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو منافقت سے کام لے کر اسلام کا نام زور سے لیتے ہیں لیکن زندگی غیر اسلامی گزارتے ہیں، ایسی حکومتیں اور حکمران درحقیقت اسلام کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو استعماری طاقتوں کے نظریاتی، سیاسی اور معاشی مقاصد کا آلۂ کار ہیں اور وہ کھل کر اپنی اسلام دشمنی اور ملت کشی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

مسلمانوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے اور ہم بحمداللہ مایوس نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ انسان کو اتنا ہی ملتا ہے جتنے کے لئے وہ کوشش کرتا ہے، یعنی قانونِ قدرت یہی ہے کہ انسان کو اگر اپنی حالت بدلنے کی پروا ہے اور وہ اس کے لئے صحیح خطوط پر کوشش کرتا ہے تو قدرت بھی اس کی مدد کرتی ہے۔ افسوس کہ مسلمانوں میں خدا اور رسولؐ کے بتائے ہوئے لائحہ عمل کے مطابق اپنی موجودہ حالت کو بدل دینے کی نہ تو کسی پُرخلوص خواہش کے آثار نظر آتے ہیں اور نہ ایمان ویقین اور اخلاص ونیک نیتی کی پوری طاقت کے ساتھ کوئی سعی وکوشش ملتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اخلاقی وروحانی انتشار اور ایمان واخلاص ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اور اس وقت امت اسلامیہ کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے۔

ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اپنی عددی قوت، مادی دولت اور وسائل وذرائع کے اعتبار سے آج اسلامی دنیا اتنی کمزور اور درماندہ نہیں ہے جتنی کہ وہ اس وقت تھی جب کہ تاتاریوں نے اس کے ایک وسیع وعریض حصے کو روند کر رکھ دیا تھا اور عام مسلمانوں کی معاشی وسیاسی تباہی وبربادی کے ساتھ اخلاقی تباہی وبربادی کا یہ عالم تھا کہ اس زمانے میں ہر طرف مسلمان یہ کہتے پھرتے تھے کہ "ہر بات مان لو، لیکن جب یہ کہا جائے کہ کسی معرکے میں تاتاریوں نے شکست کھائی تو اس بات کا یقین نہ کرو"۔ یہ تیرھویں صدی عیسوی کی بات ہے لیکن اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے صورت حال بدل چکی تھی اور صنم خانے ہی سے کعبہ کے پاسباں پیدا ہونے لگے تھے۔ یہ انقلاب حال کیسے ہوا، دنیا کو آج تک اس پر حیرت ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے

# اسلامی قانون

یہ بات حیرت اور دلچسپی سے خالی نہیں کہ آج جبکہ سائنس اور ٹیکنولوجی کی دنیا تسخیر فطرت کے محیر العقول کارنامے انجام دے رہی ہے اسی دنیا میں اسلامی قانون خصوصاً اسلام کے تعزیری قانون کے مطالعہ کی طرف غیر مسلم ماہروں نے توجہ کی ہے، خاص طور پر یورپ اور امریکہ میں ماہرین قانون کی دلچسپی اس سلسلے میں روز افزوں ہے ہمارے ملک میں بھی سنجیدہ اور غیر متعصب ماہرین قانون نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ یہ ایسا کیوں ہے؟ اور کیا بات ہے کہ ابھی کل تک قانون کے جس نظام کو تہذیب و تمدن کے نہایت ابتدائی دور کا قانون کہہ کر حقارت سے نظر انداز کر دیا جاتا تھا، آج وہی ماہرین قانون کی توجہ کا مرکز بنتا جا رہا ہے اور وہ کیا ہے جو آج ساری متمدن دنیا کیا اپنی کم نگاہی کے سبب اپنے آپ کو تمدن کی ترقی کے آخری مرحلے میں سمجھتی رہی ہے۔ اس نظام میں اپنے درد کا مداوا تلاش کر رہی ہے؟ یہ معاملہ خود مسلمانوں سے بھی جو تقریباً پچھلے دو تین سو برس سے احساس کمتری اور ایمان و یقین کے بحران میں مبتلا ہیں غور و فکر کا طالب ہے۔

ابھی حال ہی میں ہمیں اسلام کے تعزیری قانون کی معقولیت کے موضوع پر ہندوستان کے مشہور قانون داں بار کونسل آف انڈیا کے ڈاکٹر ما دھوا میلن کی تقریر سننے کا موقع ملا۔ اپنی تقریر میں انھوں نے انگلستان اور امریکہ کے قانون فوجداری کی جس کی ایک شکل ہندوستان میں بھی رائج ہے، خامیوں کا ذکر کیا اور ان ملکوں میں بڑھتے ہوئے جرائم کی طرف توجہ دلاتے ہوئے

ایک دوسری قسم کا چیلنج تھا اور انھیں اس چیلنج کا مقابلہ اسی سطح پر کرنا چاہیئے تھا۔ کہیں کہیں مقابلے کی کوشش ضرور ہوئی لیکن مجموعی طور پر یہ نہایت کمزور ثابت ہوئی۔ مسلمانوں میں جو امیر تھے، صاحب ثروت و حیثیت تھے، عالم و دانشور تھے، ان کی بڑی تعداد مرعوبیت کا شکار ہو کر رہ گئی اور ان میں عقیدے کی وہ صلابت، خدا پر گہرے اعتماد کی فعالیت اور اخلاص و اخلاق کی وہ ایجابی قوت باقی نہ رہی جو انھیں روحانی انتشار سے محفوظ رکھ سکتی۔ اُن میں جو عابد و زاہد اور صوفی تھے ان کی بھی بڑی تعداد خود اپنے مرتے خانقاہی کی انفعالی کیفیات میں مبتلا رہی۔ اس طرح اہل دانش اور اہل دل دونوں مسلمانوں کے اخلاقی انحطاط و انتشار کی علامت بن گئے۔ اس لئے نہ اخلاقی اعتبار سے نہ تو مسلمانوں کو انفرادی طور پر متاثر کر سکے اور نہ اجتماعی طور پر مسلم معاشرہ کو اخلاقی بگاڑ سے بچا سکے۔

اور اب دوسری جنگ عظیم کے بعد جب عالم اسلام کو سیاسی محکومی سے نجات مل ہے اور دنیا کے نقشے پر پینتالیس سے زیادہ آزاد مسلم مملکتیں وجود میں آچکی ہیں اور ان کے وسائل بھی کچھ ایسے محدود نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض ایسی مملکتیں ہیں جو بے پناہ وسائل کی مالک ہیں اور ان میں اہل دانش کی بھی کمی نہیں اور ہمارا خیال ہے کہ ان ملکوں میں اہل دل بھی ہوں گے تو پھر سوچنے کی بات ہے کہ کیوں انقلاب حال کی کوئی ایسی صورت نظر نہیں آتی جس سے مسلمانوں کے ایک خوش آیند مستقبل کی نشاندہی ہو۔ کہا جاتا ہے کہ مصیبتوں سے قلوب کا تزکیہ ہوتا ہے اور خوشحالی بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے کہ افلاس و محرومی کی کوکھ سے بہت سی اخلاقی خرابیاں جنم لیتی ہیں لیکن مسلمانوں کے معاملہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نہ تو مصائب و آلام سے اُن کے دلوں کی تطہیر ہوتی ہے اور نہ خوشحالی و فارغ البالی ہی سے ان کے اخلاق بہتر ہوتے ہیں۔ خدارا کوئی ہمیں سمجھائے کہ یہ کیا معمہ ہے اور یہ کیا بھید ہے جو کسی طرح کھلتا ہی نہیں۔

ہم نے اوپر جو کچھ لکھا ہے وہ بڑی دردمندی اور حسرت و آرزو کے گہرے جذبات کے ساتھ لکھا ہے ہمیں رہ رہ کر حافظ شیرازی کا یہ شعر یاد آتا ہے اور جی چاہتا ہے کہ ہم ہر مسلمان کو، خواہ وہ کسی طبقے کا ہو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر سنائیں کہ

گوئے توفیق و کرامت درمیاں افگندہ اند ❊ کس بمیداں درنمی آید سواراں را چہ شد

اور ان سے پوچھیں کہ ہمارے عالموں اور دانشوروں، قائدوں اور رہنماؤں، امیروں اور وزیروں، عابدوں اور صوفیوں کی صفوں سے کیا ایسے فعال، باہمت اور با اخلاص اہل دل نہ اٹھیں گے جو ظاہری نام و نمود، عہدہ و منصب، جاہ و مرتبت، لذت و راحت اور مادی و جسمانی ترغیبات کو بے حقیقت سمجھیں اور اس کارزار ہستی میں بے خطر کود پڑیں تاکہ انسانیت کی کشتی جو مغربی تہذیب کے بحران و انتشار کے بھنور میں پھنس کر رہ گئی ہے سلامتی کے ساتھ کنارے جا لگے۔ (جنوری ۱۹۸۱ء)

کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی نظام قانون کا نتیجہ اگر یہ نکلے تو اس نظام قانون پر کہاں تک اعتبار اور اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

مغرب کے نظام قانون میں ساری توجہ اس پر ہے کہ قانون کے ذریعہ جرائم کا انسداد ہو، اس میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے کہ قانون کے ذریعہ انسداد کی نوبت آنے سے پہلے ہی تدارک کی تدبیریں بھی ہو سکتی ہیں۔ اس میں ایسی کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ خود اندر سے کوئی قوت، کوئی آواز انسانی اعمال کو کنٹرول کرتی رہے۔ یہ بات ظاہر و باہر ہے کہ محض سزائے موت یا قید و بند کی لمبی سزا کا خوف ہی انسداد جرائم کے لئے کافی نہیں ہے۔ اور ضروری ہے کہ اس سلسلے میں قانون کے ساتھ کسی مذہبی عقیدہ کے اخلاقی محرکات بھی وابستہ ہوں۔ ہمیں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ احساس ہے کہ چونکہ اسلام کا تعزیری قانون مذہبی و اخلاقی محرکات پر مبنی ہے اس لئے غیر مسلم سماجوں کو بھی آج کے دور میں اس کی گہری معنویت کا احساس ہو چلا ہے۔ اسلامی قانون میں اصلاح اور اخلاقی بحالی کا فلسفہ کارفرما ہے اور اسلام کے قانون میں تدارکی تدابیر کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، اس وقت مغرب کے ماہرین قانون انھیں چیزوں کی تلاش میں ہیں، اس لحاظ سے بھی اِس نظام قانون کی معنویت کا احساس روز افزوں ہے۔

اسلام نے صاف صاف بتا دیا ہے کہ کون سی چیزیں ممنوع ہیں اور کون سی چیزیں معروف ہیں۔ ان کے بیچ میں واجب، مباح اور مکروہ اعمال کی قسمیں ہیں۔ اس طرح منکرات اور معروفات کے بیچ میں اعمال کی جو قسمیں ہیں ان میں محتاط انسانوں کے لئے اپنے طور پر، نافذ قانون کے خوف سے نہیں، اخلاقی اور روحانی ترقی کے بہت مواقع ہیں۔ اس طرح ایسے اعمال جن پر سزا اور شرعی حد کا نفاذ ہو بہت ہی کم رہ جاتی ہیں۔ پھر اس سلسلے میں شہادت کا جو اصول اور قانون ہے وہ اتنا سخت ہے کہ جج یا قاضی کے اختیار تمیزی کی بہت کم گنجائش رہ جاتی ہے۔ اس طرح اس نظام قانون میں قوی رجحان اس طرف ہے کہ جرم اور مجرم دونوں کے سلسلے میں معروضی طور پر معاملہ یقین کی حد تک پہنچ جائے اور پھر ضروری سزا دی جائے یا حد جاری کی جائے۔ آج یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ قانون بنا دینے سے جرائم ختم ہو جائیں گے۔ لیکن دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ قانون بنتے رہتے ہیں اور جرائم بڑھتے رہتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ قانون کا احترام دلوں میں باقی نہیں رہا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ قانون کی خلاف ورزی

یہ تبصرہ بھی کیا کہ اِن ملکوں کے قانون فوجداری میں کچھ بنیادی کمزوریاں ہیں جن سے جرائم کم نہیں ہوتے بلکہ بڑھتے جا رہے ہیں۔ انھوں نے معاشی اور سماجی عوامل کو بھی اہمیت دی، لیکن اُن کا خیال تھا کہ مذہب و اخلاق یا کسی ایسے فلسفیانہ ضابطۂ حیات سے گہرے تعلق یا جذبۂ وفاداری کے بغیر جس سے انسان کا ضمیر بیدار ہو، انسان کو سیدھے راستے پر نہیں ڈالا جا سکتا۔ اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ اس سلسلے میں اس ضمیر پر زیادہ بھروسہ کیا جا سکتا ہے جس کے زیر و بم کے تاروں کو کسی مذہبی عقیدے کی مضراب سے چھیڑا گیا ہو، کیونکہ اس صورت میں انسان کا معاملہ اُس مادی قوت سے ہوتا ہے جس میں کسی سیاست کو دخل نہیں ہوتا۔

مغرب میں انقلاب فرانس اور صنعتی انقلاب کے بعد جس طرح کا سماج رفتہ رفتہ بنا اُس میں مذہب کو اس طرح کا دیس نکالا تو دیکھنا نہیں نصیب ہوا، جیسا کہ اشتراکی انقلاب کے بعد سوویٹ یونین اور دوسرے ملکوں میں دیکھنے میں آیا، لیکن مادیت کے غلبہ نے اتنا ادبار باندھا کہ مذہب روزمرہ کی زندگی میں برتی جانے والی حاوی اقدار کے سرچشمہ کی حیثیت سے باقی نہ رہ سکا اور مغرب کے سماج میں اضافیت کی تمام ترکامرانیوں کے ساتھ سیکولرازم ہی کا بول بالا رہا۔ تجربہ سے معلوم ہوا کہ مغرب نے اپنا آشیانہ جس شاخ نازک پر بنایا تھا اس کو آج مذہب و اخلاق کے سہارے کی اشد ضرورت ہے۔ زندگی کی تلخ حقیقتوں نے مغرب پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ قانون، مذہب اور اخلاق تینوں کا باہمی خوشگوار رشتہ سماج میں امن و امان، نظم و ضبط اور عمومی خوشحالی اور اطمینان کے لیے ناگزیر حد تک ضروری ہے۔ تو دوسرے ملک میں بھی صورت حال یہی ہے اور ۱۸۶۰ء کے بعد جس قانون کو یہاں اپنایا گیا تھا، وہی آزادی کے بعد بھی سب سے زیادہ مفید، نتیجہ خیز اور ترقی پسندانہ سمجھا جاتا ہے، حالانکہ یہ قانون اور اس سے متعلق عدالتی طریق کار کسی حد تک ناکام ثابت ہو چکے ہیں۔ دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ بسا اوقات بڑے سے بڑا مجرم، بڑے سے بڑا قاتل، سنگین جرائم اور قتل کے بعد بھی مطمئن رہتا ہے کہ خود ملک میں رائج قانون اور عدالتی طریق کار اُسے بچا لے گا۔ کم مجرم قیدی ایسے ہوں گے جو قید و بند کی لمبی سزا کے مقابلے میں مرجانا پسند کرتے ہوں اور اکثر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ لمبی سزا کے بعد بہت سے مجرم اور بھی سخت دل اور شقی القلب بن جاتے ہیں اور قیدخانے سے باہر آکر سنگین تر جرم کا ارتکاب

# اصلاح وتجدد کے حامی
## اور
# اُن کی الجھنیں

عہدِ حاضر میں دنیائے اسلام میں اصلاح وتجدد کی تحریکیں بھی اٹھیں اور کئی مکتبِ خیال بھی وجود میں آئے، ایسی شخصیتیں بھی پیدا ہوئیں جو اپنی ذات سے خود ایک انجمن اور ایک تحریک تھیں، لیکن ان شخصیتوں اور تحریکوں سے مُسلم معاشرے میں اصلاح وتجدد کا جو کام ہونا چاہیئے تھا وہ نہیں ہوا اور اس کے جو نتیجے نکلنے چاہئیں تھے وہ نہیں نکلے اور مُسلم معاشرے قدیم اور جدید کی ایسی کشمکش میں مبتلا ہو گئے جس کی گود میں ذہنی وفکری انتشار اور معاشرتی واخلاقی بحران ہی پرورش پاتے رہے۔ آئیے دیکھیں کہ ہماری یہ بات کہاں تک صحیح ہے اور اگر کسی حد تک صحیح ہے تو اس کے کیا اسباب ہیں۔ لیکن اس سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ اس موقع پر ہم ساری دنیائے اسلام کی تحریکوں اور تجدد پسند شخصیتوں کا جائزہ نہیں لیں گے، صرف چند مخصوص رجحانات اور شخصیتوں ہی کا ذکر کریں گے۔

تاریخِ اسلام میں جس دور کو جمود وانحطاط کا دور کہا جاتا ہے اُس کا آغاز تیرہویں صدی میں منگولوں کے حملوں سے ہوتا ہے اور کوئی پانچ سو برس تک قائم رہتا ہے۔ پھر اٹھارویں صدی میں ہمیں جمود وانحطاط کے بادل کچھ چھٹتے نظر آتے ہیں اور انیسویں صدی

کا مداوا قانون ہی کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے، پھر یہ کہ فرد خود اپنے فعل کا ذمہ دار ہے، اس پر کوئی اخلاقی اور سماجی ذمہ داری نہیں ہے۔ اسلام میں بھی فرد ہی بنیادی طور پر اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے لیکن جرائم کی صورت میں ایک لحاظ سے دیت اور معاوضہ کی گنجائش رکھ کر اسلامی قانون نے اجتماعی ذمہ داری کا عنصر بھی اپنے اندر شامل کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ مظلوم کو ایک حد تک معاف کر دینے کا اختیار بھی ہے۔ الغرض اسلام کے قانون فوجداری کی روح یہ ہے کہ مجرم کو یہ معلوم رہے کہ جرم کی سزا ضرور ملے گی جھوٹی شہادتیں اور قانونی داؤں پیچ اُسے بچا نہیں سکتے، بے گناہ محفوظ رہیں گے۔ فرد کی اصلاح اور اخلاقی بحالی بھی قانون کی ذمہ داری ہے۔ قانون کا منشا محض یہ نہیں ہے کہ کوئی جرم کرے تو سزا ملے بلکہ یہ بھی ہے کہ قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو یہ معلوم رہے کہ چونکہ اس کا جرم اخلاقی اور سماجی جرم ہے، اس لئے وہ سزا سے بچ نہیں سکتا۔ پھر چونکہ قانون کی خلاف ورزی یا جرم مذہب اور عقیدہ کی خلاف ورزی یعنی گناہ ہے، اس لئے اُسے خدا کے سامنے بھی جوابدہ ہونا ہے۔ اسلامی نظام قانون کا یہ وہ تہ داری پہلو ہے جو خود اپنی جگہ اعمال انسانی کو متاثر کرتا رہتا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اسلام کے تعزیری قانون کا جائزہ لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ حقوقِ انسانی کی جمہوری اقدار اور سماجی انصاف کے جدید معیار دونوں لحاظ سے اسلام کا قانون جمہوری بھی ہے اور جدید بھی۔ افسوس ہے کہ مذہبی تعصب اور گروہی تنگ نظری کے سبب مغرب کی عیسائی دنیا نے اسلام کے ساتھ قدامت اور پسماندگی کا جو رشتہ جوڑ دیا تھا، اُسے اہلِ مشرق نے صحیح سمجھا، اور غلامی کے دور میں یہ بات ذہنوں میں اس طرح راسخ ہو گئی کہ غیر مسلم تو غیر مسلم، بہت سے جدید تعلیم یافتہ مسلمان بھی یہی سمجھنے لگے اور یہ بات بھلا دی گئی کہ غلاموں کی بصیرت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ سیاسی محکومی کے خاتمہ کے بعد بھی عرصہ تک محکوم قومیں ذوقِ حسن و زیبائی سے محروم رہتی ہیں۔ مقلد مذہب ہی میں نہیں پائے جاتے، مقلد جدید افکار کی دنیا میں بھی ملتے ہیں، اس ذہنی غلامی کا سلسلہ دراز ہوتا ہے اور ایسے غلام اور ایسے مقلد انھیں چیزوں کو حسین اور زیبا کہتے ہیں جنھیں ان کے آقا اور ان کے "پیر و مرشد" حسین اور زیبا کہتے ہیں۔ ہم اہلِ مشرق، مسلم اور غیر مسلم سب، جس قدر جلد اس ذہنی غلامی سے آزاد ہو جائیں اسی قدر یہ ہمارے حق میں مفید اور بابرکت ہے۔

اپریل سنہ ۱۹۸۱ء

لیکن اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مسلمانوں کو جس تہذیب کا سامنا تھا وہ اس وقت کی تہذیب اسلامی کے مقابلے میں کہیں زیادہ توانا اور طاقتور تھی، اس میں حرکت تھی اور قدیم تہذیبوں کے افکار و خیالات، عیسائی معتقدات اور خود تہذیب اسلامی کی بعض اہم سماجی و اخلاقی اقدار کا مظہر تھی، وہ گویا یونانی، ہیلینی، رومی، عیسائی اور اسلامی تہذیبوں کے حرکی عناصر کی ایک ایسی ہیئت ترکیبی تھی جس کے پیچھے جدید یورپ کی بے پناہ سائنسی، صنعتی، معاشی اور سیاسی طاقت تھی اور عیسائی مشنریوں کے تبلیغی عزائم کے سبب اس میں مذہبی داعیوں کا سا جوش و خروش بھی پیدا تھا۔ ادھر اسلامی ممالک کا جنھوں نے صدیوں ساری مہذب دنیا کی رہنمائی کی تھی، نشاۃ ثانیہ کی تہذیبی تحریک کے بعد تیزی سے ترقی کرنے والے ملکوں سے کوئی رابطہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس لیے وہ طبیعی علوم کے اس وسیع خزانے اور صنعتی مہارت کی اس بیش بہا دولت میں جو مغربی یورپ نے نشاۃ ثانیہ کے بعد کئی سو سال کی مدت میں حاصل کی تھی، حصہ نہ بٹا سکے تھے۔

ہمیں اس تاریخی حقیقت کو دیانتداری سے تسلیم کر لینا چاہیئے کہ تیرہویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارویں صدی کے وسط تک مسلم معاشرے ذہنی جمود اور تہذیبی انحطاط میں مقید رہے۔ لیکن اٹھارویں صدی میں محمد ابن عبدالوہاب (١٧٠٣-١٧٩٢) کی تحریک سے پہلی بار ایک محدود علاقے ہی میں سہی، ذہنی جمود کا یہ طلسم ٹوٹا، یہ زندگی کی علامت تھی، یہ علامت تھی اس بات کی بھی کہ تہذیب اسلامی مردہ نہ تھی، ہاں، نیم جاں ضرور تھی، لیکن اس سے بڑھ کر اصل حقیقت یہ ہے کہ راسخ العقیدگی اور تصوف کے مابین عہد وسطی کی ابتدائی صدیوں میں جو ایک خاموش مفاہمت ہو گئی تھی، یا دوسرے لفظوں میں یہ کہ خدا سے متعلق اسلام کے ماورائی تصور اور اس تصور میں کہ وہ محیط کل ہے جیسے سے جو ایک سمجھوتہ ہو گیا تھا اس سے اسلامی تہذیب کا توازن برقرار رہا اور تضادات باہم مل کر چلتے رہے، لیکن اس طرح کے سمجھوتے ابدی اور دوامی نہیں ہوتے اور کمزور و نیم جاں ہی سہی، ایک زندہ نظام میں نئے عوامل اور محرکات ابھر کر رہتے ہیں۔ محمد ابن عبدالوہاب کی تحریک دراصل اسی تاریخی حقیقت کی عملی شکل تھی۔ یہ تحریک مغرب

میں حرکت و بیداری کے آثار اُس وقت نمایاں ہونے لگتے ہیں جب دنیائے اسلام پر مغرب کے سیاسی و تہذیبی حملے بہت تیز ہو جاتے ہیں۔ ہم اس صورت حال کی تفصیل نہیں بیان کریں گے، اس کے سیاسی و معاشی پہلوؤں کو بھی نظر انداز کریں گے اور صرف یہ کہیں گے کہ یہ دو تہذیبوں کا تصادم تھا۔ ایک طرف جدید مغربی تہذیب تھی اور دوسری طرف قدیم اسلامی تہذیب۔ اس تصادم کے نتیجے میں دنیائے اسلام میں کئی طرح کی تحریکیں شروع ہوئیں، لیکن آج ہمارا موضوع صرف اصلاح و تجدد کی تحریکیں ہیں۔

عہد وسطیٰ میں اور اس سے پہلے بھی مسلمانوں کا واسطہ ایسی تہذیبوں اور قوموں سے پڑ چکا تھا جو بعض لحاظ سے اُس وقت کے معیار کے مطابق ارتقا کے کئی مراحل سے گذر چکی تھیں، لیکن اُن میں اُبھرتی اور پھیلتی ہوئی اسلامی تہذیب کی سی توانائی نہ تھی اور وہ اعلیٰ اقدار کے عالمگیر معیاروں کا ساتھ بہت پہلے چھوڑ چکی تھیں، یا تاریک خیالی کی حامل ایسی تہذیبیں تھیں جو اسلام کے کائناتی اصولوں کا جن پر تہذیب اسلامی کی بنیاد تھی، مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ دوسری بات یہ کہ اسلامی تہذیب کے پھیلاؤ کے اولین مرحلوں میں اسلامی عقائد و افکار اور اسلام کی سماجی و اخلاقی اقدار کی کوئی ایسی شکل متعین نہیں ہوئی تھی جسے اگر کسی اور طرح سے بیان کیا جاتا تو لوگ اسے دینی معاملات میں تحریف سمجھتے۔ منگولوں نے تیرہویں صدی میں جب تہذیب اسلامی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تو اگرچہ اس سے بہت پہلے راسخ العقیدگی نے عقائد کی تعبیر و تشریح اور اسلام کے سماجی و اخلاقی اقدار کی ایک خاص شکل متعین کر دی تھی، لیکن خود منگولوں کے پاس سیاسی و فوجی طاقت کے علاوہ اور کچھ نہ تھا، اس لئے اپنے علوم و فنون کے گہواروں اور اپنے تہذیبی و سیاسی مرکزوں کی تباہی کے باوجود، مسلمان ذہنی و تہذیبی سطح پر کسی مرعوبیت اور احساس کمتری کا شکار نہیں ہوئے۔ ادھر ہندوستان میں اسی دور میں تہذیب اسلامی کو جس میں عرب کا سوز دروں اور عجم کا حُسن طبیعت دونوں شامل تھے اور جو خود اپنے وطن میں برباد اور غریب الوطن ہو کر رہ گئی تھی، منگولوں کی فوجی تاخت و تاراج سے محفوظ رہ کر پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

کسی ذہنی و جذباتی ہیجان میں مبتلا نہ کرنا چاہتے ہوں اور اسی کو مناسب سمجھتے ہوں کہ ان کے اپنے مذہبی خیالات پر سیاسی و مذہبی نعروں کا پردہ پڑا رہے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ افغانی کا علم کچھ زیادہ وسیع اور گہرا نہ تھا اور اس خیال کے لوگ ان کے رسالے ردِ نیچریت کو ثبوت میں پیش کرتے ہیں، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے، افغانی کی تمام تحریروں کو دیکھیے تو پتہ چلتا ہے کہ منقولات و معقولات کے علم میں وہ اپنے ہمعصر علماء سے پیچھے نہ تھے، البتہ ان کی بعض تعبیرات سے ان کے بعض شاگرد بھی مطمئن نہ تھے، ہاں، افغانی یہ ضرور چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں مسلم فلاسفہ کی علمی روایت کو از سرِ نو زندہ کیا جائے تاکہ اس کے سہارے عصری علوم کو سیکھنے سکھانے کی ایک آزاد فضا پیدا ہو، لیکن یہ بات اگر کوئی ایسا عالم کہتا جسے عصری علوم میں سے کسی ایک ہی علم میں پوری دستگاہ حاصل ہوتی، یا کم از کم اُسے ان فلسفیانہ افکار، علمی تحریکات اور ہیومانزم کی اُس روایت سے پوری واقفیت ہوتی جو جدید مغربی تہذیب کے پیچھے کارفرما تھی تو اس کا قوی امکان تھا کہ وہ جدید افکار و نظریات اور نئی علمی و تہذیبی تحریکات کے مثبت و منفی، قوی اور کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کرتے ہوئے حیات و کائنات سے متعلق اسلامی تصورات کی کوئی جدید تعبیر کرسکتا۔ افغانی کی سب سے بڑی کمزوری یہی تھی کہ وہ ایسے نہ تھے۔ یورپین زبانوں پر جن میں سے غالباً دو زبانیں، اور وہ بھی قدرے، انھوں نے بہت بعد میں سیکھیں، انھیں قدرت نہ تھی اور مغرب کے علم و فکر کے ماخذوں تک اُن کی رسائی نہ ہوسکی تھی، اور ان کے زمانے میں ان ماخذوں کا شاید معمولی حصہ ہی عربی میں منتقل ہوا تھا، پس، افغانی نعرے تو دے سکتے تھے لیکن خالص علمی بنیادوں پر نہ تو مغرب کی تہذیب و تمدن کا تجزیہ کرسکتے تھے اور نہ اسلامی ایمانیات و تعلیمات کی کوئی جدید تعبیر ہی پیش کرسکتے تھے، پھر جس طرح کی زندگی انھوں نے گزاری اُس میں علمی مصروفیتوں اور فکری کاوشوں کے لئے نہ تو وقت تھا اور نہ کوئی گنجائش۔

ہاں، اس بات کی کوشش ان کے عزیز شاگرد مفتی محمد عبدہ (۱۹۰۵ — ۱۸۴۵ء) نے ضرور کی جنھیں ہم عصرِ حاضر میں لبرل اصلاحی تحریک کا حقیقی بانی کہہ سکتے ہیں۔ مفتی محمد عبدہ

کی سیاسی و تہذیبی بالادستی کے اثر سے نہیں ابھری تھی، بلکہ تہذیب اسلامی کی اپنی ہی داخلی کشاکش کے سبب تصادم کی یہ نئی صورت ظہور پذیر ہوئی تھی۔ محمد ابن عبدالوہاب کی تحریک کے نتائج بڑے دوررس ثابت ہوئے اور اگرچہ تصوف اور مستند راسخ العقیدگی کے خلاف اس کی شدت پسندی نے اسے بڑھنے نہیں دیا، لیکن اپنے بنیادی چیلنج کے لحاظ سے یہ کامیاب رہی کہ اس نے مسلم معاشرے کے مقید پانی میں جو ایک سنگ احتجاج پھینکا تھا اس سے اس میں ایک زندگی بخش اور تازہ کار ارتعاش پیدا ہوا جس سے دھیرے دھیرے پوری دنیائے اسلام متاثر ہوئی۔

سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷–۱۸۳۹) کی شخصیت اور سرگرمیوں کو بھی اسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ بس یہاں یہ فرق تھا کہ اب مغرب اپنی تہذیبی و سیاسی توانائیوں کے ساتھ اسلامی تہذیب سے متصادم تھا۔ لیکن افغانی کا المیہ یہ تھا کہ انھوں نے مسلمانوں کی سیاسی طاقت کو منظم کر کے مغرب کے طوفان کا منہ پھیر دینے کا منصوبہ بنایا۔ وہ مسلم حکومتوں کی بنیادی کمزوری کا صحیح تجزیہ نہ کر سکے۔ شاید ان کی سیاسی بصیرت اس حقیقت کا پوری طرح ادراک نہ کر سکی کہ مسلم حکومتوں کا جو تہذیبی پس منظر ہے وہ عہد وسطیٰ کی ایک ایسی نیم جاں تہذیب کا پس منظر ہے جو مغرب کی جدید اور زندگی سے معمور تہذیب کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ مسلمانوں سے بار بار کہتے تھے کہ خدا اس قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی خارجی اور داخلی حالت کو بدلنے کے لئے تیار نہ ہو، یہ بھی صحیح ہے کہ وہ بار بار یہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کو اپنی مذہبی اصلاح کا کام کرنا چاہیئے اور علماء کا یہ فرض ہے کہ وہ جدید فکر سے واقف اور علوم جدیدہ کے حامل ہوں، لیکن خود انھوں نے مذہبی اصلاح کا کوئی پروگرام نہیں بنایا، خود انھوں نے اپنے علمی تبحر، اپنی بے پناہ ذہانت اور اپنی عبقریت کو فکر اسلامی کی کسی جدید تعبیر و تشریح کے لئے وقف نہیں کیا، شاید وہ مزاجاً اور طبعاً اس کام کے لئے موزوں نہ تھے، غالباً وہ جرأت کے ساتھ عہد وسطیٰ کی راسخ العقیدگی کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتے تھے، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مسلم حکومتوں اور مسلم معاشرے کو اپنی سیاسی مصلحت کی وجہ سے

۱۔ جدید افکار کی روشنی میں فکر اسلامی کی از سر نو تشریح و تعبیر
۲۔ غیر اسلامی اثرات اور رسم و رواج سے مسلم معاشرے کی تطہیر
۳۔ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کی اصلاح
۴۔ عیسائی مشنریوں اور مستشرقین کے حملوں اور یوروپ کے بڑھتے ہوئے اثرات کے خلاف اسلام کا دفاع

جہاں تک اس مسئلہ کا تعلق ہے کہ جدید افکار کی روشنی میں فکر اسلامی کی نئی تعبیر کی جائے، ہمارے خیال میں یہ مرعوبیت کی علامت تھی اور اس میں اعتذار کا وہی پہلو تھا جو ہمیں مسلمانوں کی اعتذاری اور روحانی تحریکوں میں نمایاں طور پر ملتا ہے۔ افکار بدلتے رہتے ہیں، مثلاً انیسویں صدی کے سائنسداں اس خوش گمانی میں مبتلا تھے کہ سائنس حقیقتِ کائنات اور مقصدِ کائنات جیسے سوالوں کا جواب دے سکتی ہے، حالانکہ بعد میں ان کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہوگیا، یا کانٹ سے پہلے عقلیت کا تصور کچھ اور تھا۔ کانٹ نے عقل محض کی تنقید کر کے اس تصور کو غلط ثابت کر دیا۔ اس لئے ہر جدید فکری یا فکری رَو کی روشنی میں اسلامی الٰہیات و ایمانیات کی نئی تعبیر سے نوع بنوع تعبیرات کی ایک "چیستاں" تو تیار ہو سکتی ہے، لیکن اصل اسلام کیا ہے، اس سوال کا جواب نہیں مل سکتا۔

شد پریشاں خوابِ ما از کثرتِ تعبیرہا

لیکن غالباً مفتی محمد عبدہ کا یہ منشا بھی نہ تھا، وہ شاید یہ چاہتے ہوں گے کہ اسلامی اصول و عقائد کی تشریح ایسی اصطلاحوں میں کی جائے جو عصر حاضر کے انسان کے لئے قابل قبول ہو۔ اسی خیال سے وہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے نصاب کی بھی اصلاح چاہتے تھے اور اس کے خواہشمند تھے کہ مسلمان بچے اور نوجوان مدارس میں بھی سائنس، فلسفے اور ریاضی کی تعلیم حاصل کریں۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہوں گے کہ ان دونوں باتوں کا نتیجہ یہی نکلے گا کہ مسلم معاشرہ رفتہ رفتہ اوہام و خرافات اور غیر اسلامی اثرات سے پاک ہو جائے گا۔

محمد عبدہٗ یہ بات کہتے تھے کہ عقائد اور اعمال میں ہدایت حاصل کرنے کے لئے کتاب اور سنت ہی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ لیکن وہ یہ بھی کہتے تھے کہ مسلمانوں کے موجودہ

نے اس حقیقت کو سمجھ لیا تھا کہ اسلام کے اصولوں کی نئی تشریح اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب مذہبی اصلاح کے پروگرام کو جذباتیت اور انقلابی سیاست سے الگ رکھا جائے۔ لیکن عبدہ کی زندگی کے آخری برسوں میں جب کہ وہ اس حقیقت سے آشنا ہوئے، بین الاقوامی سیاست پیچیدہ تر ہوتی جا رہی تھی اور نیشنلزم کا تصور اس درجہ دلوں میں جاگزیں ہو چکا تھا کہ مسلمانوں کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ اس کی نزاکتوں اور اس کے تقاضوں کو سمجھنے کے لئے تیار نہ تھا، انجام کار اس کے بیشتر افراد جمال الدین افغانی کے پرجوش اور پرخروش لائحہ عمل ہی کے پیرو بن گئے۔ اُدھر ازہری علماء مفتی محمد عبدہ کے خیالات کے سرے سے ہی مخالف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عبدہ کی اصلاحی تحریک کے جو مفید نتائج نکل سکتے تھے اور جس پیمانے پر نکل سکتے تھے، وہ نہیں نکل سکے اور ان کا اثر بھی محدود رہا۔

مفتی محمد عبدہ چاہتے تھے کہ اس عہد جدید میں بھی مسلمانوں کے دلوں میں نئے سرے سے وہی جیتا جاگتا ایمان، وہی اخلاقی جوش عمل، وہی حقیقت پسند اور زندگی بخش نظریۂ حیات و کائنات پیدا ہو جائے جس نے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو روحانی صحت و توانائی کے ساتھ مادی قوت اور ثروت بخشی تھی۔ ان کی سب سے بڑی الجھن یا ان کے سامنے سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ جب ایک بار ایسا ہو چکا ہے تو اب ایسا کیوں نہیں ہو سکتا۔ اس 'کیوں' پر جب وہ غور کرتے تو اسی نتیجے پر پہنچتے کہ مسلمانوں کی راہ کا سب سے بڑا روڑا "تقلید" کا وہ بے لچک قانون ہے جسے کچھ تو سیاسی حالات نے اور بہت کچھ عہد وسطیٰ کے علم کلام نے استحکام بخشا تھا۔ اس لئے انھوں نے تقلید کے قلعے کو مسمار کرنے کی کوشش کی۔ پھر انھوں نے تاکید اور اصرار کے ساتھ یہ بات کہی کہ اسلام اور سائنس میں نہ تو کوئی تضاد ہے اور نہ تصادم، اسلام میں عقل اور انسان کی فہم و تدبر کا ایک مخصوص رول ہے اور اگرچہ عقیدے اور عقل کے دائرۂ کار الگ الگ ہیں، دونوں کو انسان کے ترقی کے سفر میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا چاہیئے۔ عبدہ کے اصلاحی پروگرام کے چار خاص جزو تھے:

# اصلاح و تجدد کے حامی
## اور
# ان کی الجھنیں

## (۲)

ہندوستان میں شیخ محمد عبدہ کے ہمعصر سید احمد خاں (۱۸۱۷ - ۱۸۹۸) نے بھی تجدد و اصلاح کا ایک پروگرام بنایا اور اس کے لئے انھوں نے اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر دیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ انھیں براہ راست مسلمانوں کی روحانی و اخلاقی اصلاح سے اتنی دلچسپی نہ تھی جتنی کہ ان کی ذہنی و مادی ترقی سے۔ عبدہ کی طرح انھوں نے بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسلام عقل اور سائنس کا مخالف نہیں ہے اور عبدہ اور سید احمد خاں دونوں کا اس امر پر اتفاق تھا کہ حقیقت میں مسلمانوں کی بڑی تعداد جس اسلام کو مانتی اور جس پر وہ عمل کرتی ہے، اس اسلام کو یقیناً علم اور سائنس کی ترقی سے خطرہ ہے۔ لیکن اس کے بعد سرسید کا راستہ الگ ہو جاتا ہے۔ عبدہ کی اس بات کے برخلاف کہ سائنسی عقلیت اور مذہب کے دائرۂ کار مختلف ہیں، سرسید انیسویں صدی کے یورپ کی عقلیت اور طبیعی فلسفے سے بہت زیادہ متاثر تھے اور اسی اثر سے انھوں نے "عالم طبیعی یا نیچر سے مطابقت" کا ایک معیار مقرر کر کے مذہبی عقائد کو جانچنے کی کوشش کی اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ اسلام اس معیار پر پورا اترتا ہے۔ انھوں نے مابعد الطبیعی عقائد، قرآن کے متشابہات اور معجزات کے معاملہ میں بھی عقل کو آخری معیار قرار دیا اور یہی ان کی سب سے بڑی بھول تھی۔

معاشرتی، معاشی اور سیاسی اداروں میں حالات اور مصلحت عامہ کی روشنی میں ترمیم واصلاح کی گنجائش ہے لیکن یہ ترمیم واصلاح کتاب وسنت ہی کے مطابق ہونی چاہیئے۔

شیخ محمد عبدہ کے سامنے یقیناً بہت سی ایسی احادیث رہی ہوں گی جو ان کی اصلاح و تجدد کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہوں گی لیکن حدیث کے سلسلے میں انھوں نے اپنے موقف کو مبہم رکھا۔ درحقیقت یہ بھی ان کی ایک بڑی الجھن تھی۔ تصویر کشی اور مجسمہ سازی سے متعلق جو احادیث ہیں ان کی صحت سے وہ انکار نہیں کرتے لیکن وہ اس کی تاریخی توجیہہ کرتے ہیں، لیکن اگر تاریخی توجیہہ کا دروازہ کھول دیا جائے تو پھر ان کی اس بات کی اہمیت کم ہو جاتی ہے کہ فروعی امور میں بھی ترمیم واصلاح کتاب وسنت کے مطابق ہونی چاہیئے، اس لئے کہ احادیث کی تاریخی توجیہات ہر عالم اور ہر مصلح اپنی فہم اور اپنے ذوق کے مطابق کرے گا۔

اپنی ان تمام الجھنوں کے باوجود اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مفتی محمد عبدہ نے مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھنے والے تجدد پسندوں کے لئے ایسا لٹریچر فراہم کر دیا جو اسلام کے چوکھٹے میں ترقی کے واضح مقاصد سے معمور تھا۔ لیکن چونکہ ان کی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی تھی، اس لئے بہت بڑی حد تک وہ اپنے خیالات راسخ العقیدہ دینیات اور علم کلام کی زبان واصطلاح میں بیان کرتے تھے اور صرف ماہرین علماء ہی ان مقامات کو سمجھ سکتے تھے جہاں انھوں نے کسی خاص موضوع پر قدیم علم کلام کے موقف سے انحراف یا اختلاف کیا تھا۔ اس لئے جدید تعلیم یافتہ مسلمان عبدہ کے مذہبی فکر واصول کو پوری طرح اپنا نہیں پاتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ مذہبی فکر کے میدان میں ان کے اصلاحی ومتجددانہ خیالات زیادہ نتیجہ خیز نہیں ثابت ہوئے۔

اکتوبر ۱۹۸۱ء

جائے تو معلوم ہو گا کہ کچھ سماجی واخلاقی اقدار ہیں جنھیں قرآن اور پیغمبر اسلامؐ نے بیان کیا اور جو اسلام کے بنیادی اداروں میں سرایت کر گئیں، ان اقدار میں اگر ایک طرف ساتویں صدی عیسوی کے عرب سماج کی عکاسی ہے تو دوسری طرف ان اقدار سے خصوصیت کے ساتھ اور بغیر کسی ابہام کے، (عہد جدید کی) عصریت کے تقاضے بھی پورے ہو سکتے ہیں۔ وہ اس کا افسوس کرتے ہیں کہ اسلام کی یہ خصوصیت عہدِ وسطیٰ کے شارحینِ اسلام کی گرفت میں نہ آسکی، یعنی دوسرے لفظوں میں یہ کہ عہدِ وسطیٰ کے شارحینِ اسلام کی تعبیراتِ اسلامی تعلیمات کی روح سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ سماجی۔ اخلاقی معاملات میں امیر علی کا موقف کچھ اس طرح تھا کہ وہ قرآن کی اخلاقی ہدایات اور قانونی احکامات میں فرق کرتے تھے، مثلاً یہ کہ قرآن نے قانونی طور پر تو غلامی کے رواج کو گوارا کر لیا لیکن اخلاقی سطح پر اس کی تعلیم یہی ہے کہ غلام آزاد کیے جائیں اور جیسے ہی حالات بدلیں غلامی کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اسی طرح انھوں نے تعدد ازدواج کے مسئلہ سے متعلق استدلال کیا۔ ہمارا خیال ہے کہ عہدِ وسطیٰ کے شارحینِ اسلام کی تعبیرات سے متعلق امیر علی کا خیال بہت کچھ اعتذار کا پہلو لیے ہوئے ہے۔ یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کی عہدِ وسطیٰ میں جو تعبیر ہوئی تھی اُسے اب عصرِ حاضر کی اصطلاحوں میں بیان کرنا چاہیے، لیکن یہ کہنا کہ اُس دور کے علما اور فقہا نے روحِ اسلام کو پوری طرح نہیں سمجھا، صحیح نہیں ہے۔ سماجی۔ اخلاقی معاملات سے متعلق سید امیر علی کے استدلال میں بڑا وزن ہے، کاش انھوں نے اس مسئلہ کی وضاحت کی ہوتی اور وہ قرآن کی اخلاقی ہدایات اور قانونی احکامات کے باہمی ربط اور فرق کو تمام مضمرات کے ساتھ عقل و نقل کے معیاروں پر جانچ کر قرآنی تعلیمات کی کوئی معقول تعبیر پیش کر سکتے۔

جن تجدد پسند مسلمانوں نے اسلام کے تاریخی و تہذیبی رول کو اہمیت دی، ان کا مقصد بظاہر اس سے یہ تھا کہ ایک طرف تو مغرب سے اس سطح پر اچھا اور کامیاب مناظرہ ہو سکتا ہے، اور دوسری طرف نئی اور توانا مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات کے پیشِ نظر اسلامی تاریخ و تہذیب سے متعلق مسلمانوں میں خود اعتمادی اور صلابت پیدا کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں اس کے علاوہ بھی ایک مقصد تھا اور اگرچہ تجدد و اصلاح کے حامیوں نے کسی وجہ سے کھل کر یہ بات نہیں کہی، لیکن وہ یقیناً یہ چاہتے ہوں گے کہ مسلمان

چونکہ سرسید کی تجدد پسندی کا نقطۂ آغاز ایک خاص دور کی مغرب کی عقلیت پسندی تھی، اس لئے اُن کی اسلام کی تعبیر بالکل ذاتی نوعیت کی تھی اور اُن کی تفسیر قرآن تفسیر بالرائے ہے، انھوں نے بھی بعض مخصوص تصورات کو اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کی بالکل اسی طرح جیسے عہد وسطیٰ میں مُسلم فلاسفہ نے کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی یہ کوشش نہ تو تجدد پسند مسلمانوں میں مقبول ہوئی اور نہ طبقہ علماء نے اسے قابل اعتنا سمجھا۔ سرسید کا جدید سائنس اور جدید تہذیب کا تصور کچھ رومانی قسم کا تھا۔ اسی طرح وہ مغربی تمدن کے بارے میں بھی جسے وہ "نہایت مکمل تمدن" کہتے تھے، ایک رومانی تصور رکھتے تھے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر وہ چیز جو مغرب سے آئے جدید بھی ہو اور مکمل بھی، مغرب کی تاریخ و روایات اور رہی ہیں، وہاں کے طبیعی و جغرافیائی حالات مختلف ہیں، سماجی ماحول دوسرا ہے اور اس ماحول کے ارتقاء کے مرحلے مختلف محرکات و عوامل سے متاثر ہوئے ہیں، اس لئے مغربی تمدن کے بارے میں سرسید کا موقف علمی اور سائنٹفک نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو وہ اسلام کی کوئی معقول تعبیر و تشریح کر سکے اور نہ کوئی سماجی اصول اخلاق ہی پیش کر سکے۔ حدیث کے بارے میں شروع میں تو سرسید کا رجحان یہ تھا کہ صحیح اور غیر صحیح احادیث میں فرق کرنا چاہیئے۔ لیکن بعد میں انھوں نے اس سے مکمل طور پر انکار کر دیا۔ آج جو ہمارے یہاں اہل قرآن کا ایک چھوٹا سا طبقہ پایا جاتا ہے وہ سرسید کے اسی رجحان کا وارث ہے۔

اسلامی تجدد پسندی میں ایک رجحان یہ بھی رہا ہے کہ اسلام تہذیب و تمدن کے بارے میں حرکت اور ترقی کا حامی ہے اور آج کی جدید تہذیب بھی اسلام کی بدولت ہی قدامت کی کوکھ سے نکل کر ارتقاء کے مختلف مراحل سے گذرتی ہوئی اپنی موجودہ شکل میں ظہور پذیر ہوئی ہے مفتی محمد عبدہ نے بھی اپنی کتاب الاسلام والنصرانیۃ میں یہی ثابت کیا تھا کہ اسلام نے ایک ترقی پذیر تہذیب کی بنا ڈالی اور اسے اپنی داخلی حرکت کے ذریعہ پروان چڑھایا جبکہ عیسائیت نے کلیسا کے ذمہ داروں کے ذریعہ عقلیت اور تہذیب کے کارواں کو آگے بڑھنے سے روکنے کی کوشش کی۔ اس رجحان کو سید امیر علی (م ۱۹۲۸) نے اپنے دلائل سے بڑی تقویت بخشی اور اسے عام کر دیا۔ امیر علی کا بنیادی موقف مختصراً یہ تھا کہ اگر اسلام کی تعلیمات کو ٹھیک ٹھیک سمجھا

میں جس کا عنوان "خودی، جبر و قدر اور حیات بعد الموت" ہے، راسخ العقیدہ علم کلام کے کئی مسلّمات مجروح ہوتے نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جنت اور دوزخ کو احوال سے تعبیر کیا اور کہا کہ یہ کسی مقام اور جگہ کے نام نہیں ہیں۔ یہ بات ہمیں مسلم فلاسفہ خصوصاً ابن سینا کی یاد دلاتی ہے۔ راسخ العقیدگی کی شان میں یہ ایک جرأت مندانہ گستاخی تھی، ممکن ہے کہ اس برصغیر کے کچھ دانشور اقبال کی اس جرأت آموزی سے متاثر ہوئے ہوں لیکن ہمارا خیال ہے کہ مجموعی طور پر مسلمانوں کے مذہبی فکر پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

اقبال نے اپنے خیال میں ایک لبرل علم کلام کی بنیاد ڈالنی چاہی تھی۔ انھوں نے ذات الٰہی کے تصور اور جبر و قدر اور حیات بعد الموت کے نظریئے پر بحث کرکے۔ حقیقت کا ایک حیاتی اور حرکی تصور پیش کرکے اور قرآنی آیات کے چوکھٹے میں اپنے خیالات کی تصویر جڑ کر، اس دعوے کے ساتھ کہ یہ سب اسلامی تعلیمات سے ماخوذ ہے، غیر شعوری طور پر اسلام میں مغرب کے اُن فکری رجحانات کو داخل کرنا چاہا جنھوں نے رفتہ رفتہ عیسائی مذہب کو محض "ہیومانزم" کے مذہب میں تبدیل کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی مذہبی فکر کی وہ روایت جس میں قرن اول سے لے کر اب تک ایک تسلسل رہا ہے، اس خطرناک بدعت کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

ایسا لگتا ہے کہ اقبال مغربی فلسفے کے اثر سے آخر وقت تک آزاد نہ ہو سکے۔ مغرب کے جدید فلسفے اور نفسیات کے سہارے ان کا استدلال کبھی برگساں کے مخالف عقلیت فلسفے سے جا ملتا ہے اور کبھی صوفیہ کے دینیاتی نظام کی ترجمانی کرنے لگتا ہے۔ انھوں نے چاہا تو یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے قدیم علم کلام کی تشکیل جدید کریں لیکن ہوا یہ کہ انھوں نے صوفیہ کے علم کلام کی نئی تعبیر کی۔ یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوتی ہے، لیکن کیا کیا جائے صورت حال کچھ ایسی ہی ہے۔ عبدہ اور سرسید نے قدیم راسخ العقیدگی کی بنیادوں ہی پر ایک لبرل اسلام کی دعوت دی تھی، لیکن اپنے آخری منطقی نتیجے میں اقبال کا فکر اس دھارے سے الگ نظر آتا ہے یہ اقبال کی انفرادیت بھی ہو سکتی ہے اور فکر اسلامی کو ان کی مخصوص دین بھی۔

اقبال کی شاعری ہو، خطبات ہوں یا ان کے وہ خطوط جن سے ان کے مذہبی فکر پر کچھ روشنی پڑتی ہے، سب میں اعتذاری رومانی رجحان ملتا ہے۔ اسی لیے خالص عملی سطح پر

مغربی تہذیب کو اپنی ہی تہذیب کی توسیع سمجھ کر جدید مغرب کی عقلیت اور مغربی ہیومانزم کو قبول کرلیں۔ ان کے نزدیک یہ چیزیں وہی ہیں جو اسلامی تہذیب کے عروج کے زمانے میں اہل مغرب نے مسلمانوں کے علمی و تہذیبی مراکز سے حاصل کی تھیں۔ اقبال (۱۹۳۸-۷۷) نے اس تخیل کو بلند فلسفیانہ سطح پر اپنے خطبات میں پیش کیا جنھیں ایک عرصہ کے بعد مسلمان اب سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

لیکن اقبال اور دوسرے تجدد پسندوں کے اس تخیل کا سرا ایک بالکل مختلف جہت سے بھی ملا ہوا ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ پیغمبر اسلامؐ خاتم النبیین تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام آخری مذہب ہے جس کی بنیاد وحی الٰہی ہے۔ اب انسان کا شعور اتنا پختہ ہو چکا ہے اور اس کی ذہنی و قلبی استعداد ایسی سطح پر پہونچ گئی ہے کہ وہ قرآن کی بتائی ہوئی ابدی حقیقتوں کی روشنی میں اپنی اخلاقی و ذہنی نجات کا سامان فراہم اور اپنے مقدر کی تعمیر خود کر سکتا ہے۔ قرآن نے انسان کو قدیم زمانے کے اس ماحول سے آزاد کیا جہاں اس کے لئے حیات و کائنات کے معاملے ایک راز سربستہ تھے۔ قرآن نے اس سلسلے میں تدبر و تفکر کی دعوت دے کر ذہن انسانی کو ترقی کے مراحل طے کرنے کا گر سکھایا اور دنیا نے دیکھا کہ مسلمانوں نے تلاش و تحقیق کی ایک روایت قائم کرکے انسان کو تہذیب کی اس سطح پر لاکر کھڑا کر دیا جہاں وہ آج اپنے آپ کو پاتا ہے۔ تاریخ کی یہ وہ سچائی ہے جسے تہذیب انسانی کے غیر متعصب مورخین تسلیم کرتے ہیں، لیکن مسلم تجدد پسندی نے ابھی تک یہ کام نہیں کیا کہ اس سچائی کو علمی سطح پر وضاحت سے بیان کرے۔ یقیناً اس کے لئے برسوں کی صبر آزما علمی کاوش اور ان تھک جگر سوزی کی ضرورت ہے اور یہی چیز مسلمانوں میں نہیں ملتی۔

اقبال کی شاعری کے مقابلے میں، جس میں جدید فلسفے اور صالح اسلامی تصوف دونوں کے اثرات نمایاں ہیں اور جس میں احساس کی شدت اور تخیل کی بے قید بلند پروازی کی وجہ سے رومانیت کا عنصر غالب ہے، اُن کے مذہبی فکر میں زیادہ ترتیب اور تنظیم ملتی ہے ان کے خطبات کو دیکھئے تو اس میں بڑی حد تک تجدد کی شان نظر آتی ہے۔ چوتھے خطبے

پوزیشن غیر معتبر بلکہ مشتبہ تھی، یہ طبقہ فقط اپنا ہی ترجمان بن کر رہ گیا۔ درحقیقت اس کام کو وہی علمی طبقہ آگے بڑھا سکتا تھا جو ایک " مربوط نصاب تعلیم " کا تربیت یافتہ ہو لیکن یہ مربوط نصاب تعلیم " دیوانے کا خواب ہی رہا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی تجددپسندی کے ابتدائی رجحانات نے فکر و عمل کی دو مختلف اور متضاد راہیں اختیار کر لیں۔ ان میں سے ایک راہ تقریباً پوری کی پوری مغربیت کی راہ تھی اور دوسری " اساسیت " یا احیائیت کی۔ بیسویں صدی کے دوسرے دہے سے ہی مسلمانوں کی ذہنی و روحانی زندگی میں ان دونوں رجحانات کی باہمی کشاکش نمایاں ہونے لگی تھی، واقعات سے ثابت ہے کہ اس کشاکش میں اساسیت یا احیائیت ہی کا پلہ بھاری رہا ہے۔ آئیے دیکھیں کہ اس کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں:

ایک سبب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اساسیت اسلامی تجددپسندی کی تحریک سے قبل کی اصلاحی تحریکات کی براہ راست وارث اور اس روایت کا تسلسل ہے جو مغرب کے اثر سے نہیں بلکہ خود اسلامی معاشرہ کی داخلی کشاکش سے ابھری تھی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں قدامت پسند علماء نے اس روایت کو بدعت سے تعبیر کیا تھا۔ لیکن بیسویں صدی میں جب کہ اسلامی معاشرے کے لئے یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں اس پر مغربیت کا رنگ پوری طرح غالب نہ آجائے، تو یہی بدعت ایک اچھی روایت بن گئی اور اس کے تطہیری موقف میں جاذبیت پیدا ہو گئی۔

دوسرا یہ کہ اسلامی معاشرہ کی سالمیت کو اندر اور باہر سے جو خطرہ لاحق تھا، اس کا شدید تقاضا تھا کہ ایک متحدہ اور مضبوط محاذ بنے۔ انتشار و بحران کی صورت میں ہمیشہ اساسیت ہی کے کسی نہ کسی روپ نے مورچہ لیا ہے۔ اساسیت میں ایک طرف تو قدامت پسندی کے نرم رویہ سے نبرد آزما ہو سکنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور دوسری طرف وہ آزادہ روی یا لبرلزم کی مطلق العنان مہم جوئیوں سے بھی نبٹ سکتی ہے۔ عقیدہ کی پختگی اور یقین کی محکمی ہی کڑے وقت میں کام آتی رہی ہے، مدلل فلسفیانہ بحثوں نے گمان آباد ہستی میں کبھی کوئی قندیل نہیں روشن کی۔

اور تیسرا سبب یہ کہ مغربیت کے حامی خود مغربیت کے جواز کے لئے کوئی مستحکم اساس

باوجود اس کے کہ وہ ترقی و تجدد کے حامی ہیں، تحفظ پسندی کا جذبہ غالب آجاتا ہے۔ ایک اور بات یہ کہ اقبال نے "وجدان" کو بعض اوقات اتنی اہمیت دی کہ "عقل و خرد" ناقابل اعتنا ٹھہری، کبھی انھوں نے دونوں میں ایک نامیاتی ربط کی بات کہی اور کبھی یہ کہا کہ عقل اور وجدان کی جہتیں الگ الگ ہیں، فلسفے اور نفسیات کا یہ وہ اعلیٰ مقام تھا جہاں عام ذہن کی رسائی ممکن نہ تھی، اس طرح باوجودیکہ اقبال کے پیغام نے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ان میں ایک نیا ولولہ، امید اور حوصلہ ہوا، مسلمانوں کے جوشِ عمل میں عام طور پر عقل و خرد کے استخفاف کا پہلو نمایاں ہو گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ عمل و حرکت کے پُرشور نغمے میں اقبال کی ذہنی و فکری کاوشوں کی آواز جن سے عمل و حرکت کا "سُر" ابھرا تھا، دب کر رہ گئی ـــــ اب اگر ہم تجدد و اصلاح کے مختلف رجحانات کا ایک ساتھ جائزہ لیں تو جو تصویر بنتی ہے وہ کچھ اس طرح ہے :

اسلامی تجدد پسندی نے اپنے اولین مرحلوں میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کے چوکھٹے میں جدید افکار و ادارت کی گنجائش نکال لینے کی حمایت کی اور اس طرح ایک حد تک مغرب کے اثر کا، جو پہلے ہی سے موجود تھا اور جس سے آیندہ بھی بچنا مشکل تھا، مذہبی و عقلی جواز پیش کیا لیکن عملی سطح پر اس اثر کو اسلامی اقدار کے نظام میں سمو لینے کا کام آسان نہ تھا۔ اسلام کے اساسی مذہبی اور اخلاقی اصول کیا ہیں، انھیں مسلمانوں کے روحانی اور تمدنی عروج کے زمانے میں، مختلف حالات وضروریات کے تحت کیسے برتا گیا اور کس طرح اسلام کے اساسی اصولوں نے ایک مستحکم محور کی حیثیت سے، بدلتے ہوئے حالات وضروریات کے باوجود، زندگی کی ہر حرکت کو اپنے سے وابستہ رکھا ــــ ان سب امور کا معروضی و تحقیقی نقطۂ نظر سے پتہ لگانا خاصی دیدہ ریزی کا کام تھا۔ پھر مغربی تہذیب کے تاسیسی عوامل و محرکات کی علمی تحقیق و تنقید اور اس کے کھرے اور کھوٹے کی پہچان گہری فکر و نظر اور ہمہ گیر مطالعے کی طالب تھی اور ان سب کے لئے ایک عرصہ کی محنت و کاوش کی ضرورت تھی، لیکن شروع کے تجدد پسند اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ مستقبل میں نئے خطوط پر کام کی راہ دکھا دیں۔ اب سوال یہ تھا کہ اس کام کو آگے کون بڑھائے؟ علما اپنی مخصوص تعلیم اور ذہنی تربیت کے سبب اس کام کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے تھے اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اپنی نادانی سے اسے اپنی ذمہ داری سمجھ بیٹھا اور چونکہ مذہبی علوم کے سلسلے میں اس کی

# اسلام اور مستشرقین
## ایک تاریخی سیمنار

فروری ۱۹۸۲ء کے آخری ہفتہ میں (۲۱ رتا ۲۳ رفروری) دارالمصنفین (شبلی اکادمی) اعظم گڑھ میں ایک بین الاقوامی سیمنار منعقد ہوا۔ اس علمی اجتماع میں بحث کا موضوع "اسلام اور مستشرقین" تھا۔ اس میں ہندوستان کی عربی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں کے عالموں اور دانشوروں کے علاوہ سعودی عرب، قطر، پاکستان، تھائی لینڈ، جاپان اور ڈربن (جنوبی افریقہ) کے عالم اور دانشور شریک ہوئے۔ افتتاحی اور اختتامی اجلاس دونوں کی صدارت قطر کے علامہ یوسف القرضاوی نے کی۔ دونوں اجلاسوں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی بھی تقریریں ہوئیں جو ان کے خاص اسلوب بیان اور فکرانگیز مواد کی وجہ سے اس مجمع علمی میں بہت پسند کی گئیں، صدر اجلاس کی فصیح و بلیغ عربی نے موضوع کی اہمیت کو اور بھی اجاگر کیا۔ تینوں دن مقالہ خوانی کی نشستیں، مقالات کی علمی ثقاہت، تبادلۂ خیال کے معیار اور شرکاء کی کثرت کے اعتبار سے بڑی پر رونق تھیں، اس سے ضلع اعظم گڑھ کے پڑھے لکھے طبقے کے علمی و دینی مذاق کا بھی اندازہ ہوا اور دارالمصنفین کے علمی کاموں کی قدر و اہمیت کا بھی، اور اس بات کا بھی کہ اس ضلع کے تعلیمی و علمی حلقے کو دارالمصنفین کے وجود اور اس کی تصنیفی سرگرمیوں سے کتنی دلچسپی ہے۔

شبلی اکادمی کے ناظم سید صباح الدین عبدالرحمن ہیں، سیمنار کے موقع پر ان کے حسنِ انتظام

فراہم نہیں کرسکتے تھے کیونکہ مغربیت کا پودا ایک مختلف زمین اور آب و ہوا کا پودا تھا، پھر جدید مغربیت، جس کی ایک انتہا پسندانہ الحادی تعبیر مارکسیت ہے، سر تا سر سیکولر لازم تھی اور کسی ایسے نظام میں جوں کی توں کھپ نہیں سکتی تھی جس کی اساس خالصتاً روحانی و اخلاقی ہو۔

اساسیت اور خالص مغربیت کی اس صف آرائی میں مسلم معاشروں میں موثر، متوازن اور معقول تجدد پسندی معدوم سی ہوگئی ہے۔ شروع کے تجدد پسندوں نے جو کام کیا تھا اب اس سے دلچسپی بھی بہت کم نظر آتی ہے۔ یہ صورت حال افسوسناک ہے، ہمارے خیال میں یہ مسئلہ اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس سے فکری سطح پر مسلمانوں میں عمل اور رد عمل کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوگیا ہے جس نے انھیں نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس لئے یہ صورت حال ایسی ہے کہ اس پر بیدار مغز علما اور صاحب ایمان دانشوروں دونوں کو تشویش ہونی چاہیئے، ورنہ اس کا قوی اندیشہ ہے کہ مغربیت اپنے بھیانک مضمرات کے ساتھ مسلم معاشرے پر چھاتی چلی جائے گی۔ بیشتر مسلم ممالک کی اس وقت جو حالت ہے وہ سب پر عیاں ہے کہ ان ملکوں میں کتاب اور سنت کا نام تو بہت لیا جاتا ہے لیکن عام زندگی پر مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات غالب آتے جا رہے ہیں۔

جنوری سنہ ۱۹۸۲ء

مقاصد کے تحت دار المصنفین کا قیام عمل میں آیا ان میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ دین اسلام، سیرت نبویؐ اور اسلامی علوم و فنون سے متعلق جو تحقیقات ہوتی رہتی ہیں، ان کا جائزہ لیا جاتا رہے۔ جہاں جو کام اچھا دکھائی دے اس کی داد دی جائے اور جہاں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کوئی غلطی نظر آئے اس کی نشاندہی خالص علمی اور تحقیقی رنگ میں کی جائے، جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں علامہ شبلی نے لکھا تھا:

"... مصنفین یورپ تین قسموں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں: (۱) جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں۔ ان لوگوں کا سرمایہ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے کہ مشتبہ اور نامکمل مواد کو قیاس اور میلان طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں (۲) (جو) عربی زبان، علم و ادب، تاریخ و فلسفہ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں، لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے نا آشنا ہیں۔ ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام پر یا شارح اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں، لکھ جاتے ہیں، مثلاً جرمن کا مشہور فاضل ساخو نے طبقات ابن سعد شائع کی ہے تو اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے، بیرونی کی کتاب الہند کا دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے، رشک کے قابل ہے، لیکن اسی دیباچہ میں جب وہ اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے جس کو پڑھ کر بھول جانا پڑتا ہے کہ وہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا۔ نولدیکے (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے، لیکن انسائیکلوپیڈیا (جلد ۱۶) میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے، جا بجا نہ صرف اس کے تعصب، بلکہ اس کی جہالت کے راز نہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔ (۳) وہ مستشرقین جنھوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، مثلاً پامر صاحب یا مارگولیوس صاحب، ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے تھے، لیکن باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ اور تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ ع

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں

"مارگولیوس نے مسند امام احمد بن حنبل کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے

میں سوز و ساز کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، اکادمی کی عمارتیں خوب سجی تھیں، ان عمارتوں کے
چھوٹے سے مجموعے میں اکادمی کی مسجد دلہن بنی ہوئی تھی، شب میں بجلی کے روشن قمقموں میں
اکادمی کا پورا احاطہ ایک عجیب پُر اسرار حسن کا سماں پیش کرتا تھا، یہ سماں اتنا دلکش اور
سحر انگیز تھا کہ شہر کے لوگ خصوصاً برقعہ پوش عورتیں اس طرح اسے دیکھنے آتی تھیں جیسے
کسی مقدس مقام کی زیارت کرنے آئی ہوں، رات ہو کہ دن، اس احاطے کے حسن اور دلکشی
کا راز بھی درحقیقت اس بات میں ہے کہ یہاں سیرۃ النبیؐ لکھی گئی جس کے عظیم المرتبت
مصنف علامہ شبلی اس کی خوبصورت مسجد کے بائیں ابدی نیند سو رہے ہیں، سیرۃ النبیؐ
کے سلسلے کا آغاز حضرت علامہ کا توشۂ آخرت تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق قلبی
رکھنے والے اور آپؐ سے محبت کرنے والے ان کے مندرجہ ذیل اشعار کو پڑھتے ہیں تو دل
کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے، نہ معلوم ان اشعار کی آمد کے وقت خود علامہ پر کیا گذری ہوگی:

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرتِ پیغمبرِ خاتمؐ
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا خطبۂ استقبالیہ بڑا پُر مغز تھا، اس میں
جہاں ایک طرف اس بات پر روشنی ڈالی گئی تھی کہ دارالمصنفین کے قیام کا کیا مقصد تھا،
وہیں ایسے اشارات بھی تھے کہ اس علمی ادارے نے اس مقصد کو کہاں تک پورا کیا اور
چونکہ یہ مقصد ایک پیغام بھی تھا، اس لئے دارالمصنفین اس علمی اجتماع کے ذریعہ اپنے
مقصد اور پیغام کو گذشتہ اڑسٹھ سال کی طرح ہمیشہ زندہ و متحرک رکھنے کا عزم رکھتا ہے
اور دنیا کے تمام عالموں اور دانشوروں کو اپنے اس علمی سفر میں شریک ہونے کی دعوت
دیتا ہے۔ سمینار اور اس ادارے کے موضوع کے پیش نظر ہم اس مقصد اور پیغام کو
دارالمصنفین کے بانی علامہ شبلی مرحوم اور اُن کے شاگرد رشید اور جانشین مولانا سید سلیمان
ندوی مرحوم کے خیالات بیان کر کے عام کرنا چاہتے ہیں۔ باخبر حضرات جانتے ہیں کہ جن

کو اپنی طرف مائل کیا، اور مستشرقین کے نام سے ایک مستقل گروہ نے عربی علوم وآداب کی حفاظت
واشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ ان کی یہ قابل قدر سرگرمیاں ہمارے شکریئے کی
مستحق ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ علوم ان کے نہ تھے، اس لئے وہ ہمدردی و محبت جو
مسلمانوں کو اپنی چیزوں سے ہوسکتی ہے ان کو نہیں ہے، اس لئے ان کی تحقیق وتدقیق سے
جہاں فائدہ ہورہا ہے، سخت نقصان بھی پہونچ رہا ہے جس کی تلافی آج مسلمان اہل علم
کا فرض ہے۔ ان میں ایک ایسا گروہ بھی ہے جو اپنے مسیحی اور مغربی نقطۂ نظر سے اسلامی
علوم پر نظر ڈال کر تحقیق وریسرچ کے نام سے ایک نیا محاذ جنگ بناکر، اسلام، داعی اسلامؐ
اور اسلامی علوم وآداب اور اسلامی تہذیب وتمدن پر بے پناہ حملے کررہا ہے، قرآن مجید، حدیث
تصوف، سیر، رجال، کلام اور فقہ، سب اس کی زد میں ہے۔ نہیں کہا جاسکتا کہ یورپ کے
اس رنگ کے لٹریچر سے اسلام کو کس قدر شدید نقصان پہونچ رہا ہے اور پہونچے گا۔ اگر یہ زہر
اسی طرح پھیلتا رہا اور اس کا تریاق نہیں تیار کیا گیا تو معلوم نہیں کس حد تک نوجوان مسلمان
دماغوں میں سمیت سرایت کرجائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے یہ خیالات پورے سمینار
پر چھائے رہے، مقالہ نگاروں میں سے کئی نے مستشرقین کے کام میں جو اچھے پہلو تھے انھیں
سراہا، لیکن بعض پہلوؤں کی مضرت رسانی اور غلط کاری کی نشاندہی بھی علمی انداز میں کی، اور
یہی متوازن انداز فکر بھی ہے۔ مولانا علی میاں کی تقریروں میں بھی یہی متین اور متوازن زاویۂ نظر
نمایاں تھا۔ لیکن مقالہ نگاروں میں ایسے یک رُخے بھی تھے جو "صراط مستقیم" سے ہٹے ہوئے
تھے اور جو تمام مستشرقین کی پوری پوری خبر لینے ہی میں اسلام کی خدمت تصور کرتے تھے۔
یہاں تک کہ اُن کے غیظ وغضب کا نشانہ وہ لوگ بھی بنے جو یورپ یا امریکہ کی کسی
یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں اور جن کی "بدبختی" سے اُن کے اساتذہ میں کوئی مستشرق بھی ہے۔
ایسے لوگوں کو ہم یک رُخا اس لئے کہتے ہیں کہ ان کے "اسلام" اور "ایمان" کا پیمانہ نہایت
محدود اور بہت تنگ ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مستشرقین کے
شاگردوں میں ایسے لوگ بھی ہوسکتے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ اپنی خاص رحمت سے نواز سکتا

اور ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہوسکتا، لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے دنیا کی تاریخ اس سے زیادہ کوئی کتاب کذب و افترا اور تاویل اور تعصب کی مثال کے لئے پیش نہیں کرسکتی۔ اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہوسکتا، صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے . . .

"یوروپین مصنفین کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے، لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی وجہ سے ہم ان کو معذور سمجھ سکتے ہیں۔ (۱) سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام سرمایۂ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں، مثلاً مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد ابن اسحٰق، تاریخ طبری وغیرہ وغیرہ . . . لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے اعتبار سے بلند رتبہ ہو . . . . آنحضرتؐ کی سوانح عمری کے یقینی واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بہ روایات صحیحہ منقول ہیں۔ یوروپین مصنفین اس سرمائے سے بالکل بے خبر ہیں اور ایک آدھ کوئی ہے (مثلاً مارگولیس)، تو وہ اس فن کا ماہر نہیں، اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لئے کافی ہے۔ (۲) دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یوروپ کے اصولِ تنقیح شہادت اور ہمارے اصولِ تنقیح میں سخت اختلاف ہے۔ یوروپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب، . . . فرض کرو ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائن موجودہ اور گردوپیش کے واقعات کے لحاظ سے صحیح معلوم ہوتا ہے، بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے نہیں اکھڑتا، تو یوروپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صورت تسلیم کرلی جائے گی۔"

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مستشرقین کی جماعت سے متعلق لکھا تھا:

"یوروپ کے اہل علم نے جہاں علوم جدیدہ کا سرمایہ فراہم کیا اور اپنے یوروپین لٹریچر کو نئے نئے اسلوب میں شائع کیا، وہاں علوم اسلامیہ کی اہمیت نے بھی ان کے علمی شغف

و اخلاقی اقدار کے فروغ و استحکام کے لئے دنیائے اسلام سے تعاون کی خواہاں ہے اور رومن کیتھولک چرچ نے تو یہاں تک تسلیم کر لیا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پیغمبر تھے۔ پروٹسٹنٹ عیسائیوں میں بھی پروفیسر گب جیسے مستشرق گذرے ہیں جو اسلام کا مطالعہ ایک ایسے عیسائی کی حیثیت سے کرتے تھے جو دونوں مذاہب میں مشترک روحانی اقدار کی تلاش میں رہتے ہیں۔ لیکن اس تلاش و جستجو کی راہ میں پہلا ہی قدم غلط اٹھتا ہے جو انھیں مسلمانوں سے دُور کر دیتا ہے اور مسلمانوں کے نزدیک روحانی اقدار کا جو سرچشمہ ہے اسی کی ماہیت و کیفیت سے متعلق بحث چھڑ جاتی ہے۔ مثلاً ایسے عیسائی بھی جو مشترک روحانی اقدار کی تلاش میں ہیں، قرآن کو وحی الٰہی تسلیم کرنے سے کتراتے ہیں اور اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ قرآن کی اساس یہودی۔ نصرانی روایات ہیں، حالانکہ جب سے مغرب کی علمی دنیا میں سائنٹفک تاریخی اصول تنقید کا چرچا ہوا، اس وقت سے لے کر آج تک یہ دعویٰ پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچ سکا اور صرف ایک مفروضہ ہی رہا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طویل عرصے تک، تمام ذہنی و مادی وسائل کے ساتھ، تاریخی تنقید و تحقیق کے جدید اصولوں کو برت کر، عیسائی و یہودی دنیا اس بات کا کوئی قطعی اور فیصلہ کن ثبوت فراہم نہ کر سکی کہ قرآن کریم پیغمبر اسلامؐ کی تالیف ہے جسے آپؐ نے یہودی۔ عیسائی روایات سے استفادہ کر کے اور تورات اور انجیل مقدس سے بہت کچھ مستعار لے کر مرتب کیا۔ اس سلسلے میں اگر کوئی معاصر اور زندہ شہادت ہے تو وہ خود قرآن ہے جس سے اس طرح کا کوئی امکان خارج از بحث قرار پاتا ہے۔ تاریخی تنقید و تحقیق کے مستند اور جدید اصول کے مطابق اس بولتی ہوئی معاصر دستاویزی شہادت کو جس کے علاوہ کوئی اور شہادت موجود نہیں، تمام لایعنی قیاس آرائیوں سے بالاتر اور یقینی سمجھنا چاہیئے۔ لیکن آج بھی بڑے اور سنجیدہ مستشرقین بھی اس زندہ حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اِن مستشرقین کے اس رویے کی توجیہہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے مذہبی عقائد اور اس سلسلے میں تعصب اور جانبداری کی وہ روایات جو انھیں اپنے علمی ماحول اور اپنے پیش روؤں سے ورثے میں ملی ہیں، ان کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں اور "ہدایت" کی طرف بڑھنے نہیں دیتیں۔

ہے، کیا خبر کہ ایسے مسلمانوں کو "طوفانِ مغرب" نے بہتر مسلمان بنا دیا ہو اور جس محاذ پر وہ خود دیر تک ٹھہر نہیں سکتے وہاں ان مسلمانوں کے قدم مضبوطی سے جمے ہوئے ہوں۔ اللہ کی رحمت ہر شے پر محیط ہے، نہ معلوم اُس خزانۂ غیبی سے کسے کس وقت کیا مل جائے۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے پہلے تین دہوں میں علم الاستشراق کی جو صورت تھی وہ آج نہیں ہے۔ آج مستشرقین کا وہ علمی معیار نہیں رہا ہے جو پہلے تھا، دوسرے یہ کہ اب، خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد مسلم ممالک کی آزادی، پٹرول کی حکمرانی اور مسلمانوں کی عام بیداری نے مغرب و مشرق دونوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اسلام اور اسلامی تمدن کو "لاشۂ بے جان" تصور کر کے ان کا پوسٹ مارٹم نہیں کیا جا سکتا، وہ زندہ حقیقتیں ہیں، وہ فنا کبھی نہیں ہوئی تھیں، ہاں دب گئی تھیں اور اب پھر اُبھر کر سامنے آگئی ہیں۔ اس لئے آج مستشرقین باوجود اپنے سیاسی و مذہبی تعصب کے خالص علمی سطح پر اسلام، پیغمبر اسلامؐ اور اسلامی علوم و آداب اور تہذیب و تمدن پر اس قسم کے حملے کر کے جیسے کہ پہلے ہوا کرتے تھے، بچ کر نکل نہیں سکتے۔ اب خود اُن ہی سے استفادہ کئے ہوئے ایسے مسلمان عالموں اور دانشوروں کی ایک جماعت دنیائے اسلام میں پیدا ہو چکی ہے جو اُن کی غلط اندیشیوں کی نشاندہی کر سکتی ہے اور جو تحقیق و ریسرچ کے جدید اصولوں سے نہ صرف واقف ہے بلکہ انھیں برتنے کا سلیقہ بھی رکھتی ہے۔ ابھی حال میں طباوی مرحوم نے جو چند مہینے ہوئے لندن میں ایک حادثہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے، اپنے چند ہمعصر مستشرقین کی "علمی کاریگری" کا پردہ فاش کیا تھا جس کا جواب اگرچہ مستشرقین کے حلقے سے دینے کی کوشش کی گئی، لیکن مغرب اور مشرق دونوں جگہ اہلِ نظر نے دیکھا کہ ان کی بات کچھ یوں ہی سی رہی۔

ایسا نہیں ہے کہ پہلے ایسے خود دار اور باحمیت عالم اور دانشور نہ تھے جو مستشرقین کو چیلنج کر سکتے۔ سید جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، سرسید، امیر علی، اقبال، سب نے اپنے اپنے طور پر یہ خدمت انجام دی، لیکن اب پہلے کے مقابلے میں دنیائے اسلام ہر لحاظ سے بہتر حالت میں ہے، اس لئے اب ہمیں مستشرقین کے رویے میں خاصی تبدیلی ملتی ہے۔ اب مسیحی دنیا کو خود اشتراکیت سے خطرہ ہے جس نے اسی کی کوکھ سے جنم لیا ہے، اس لئے وہ مشترک روحانی

# بین الاقوامی قرآن کانگریس

آج سے دو برس پہلے کینبرا (آسٹریلیا) میں تقویم ہجری کے چودہ سو سال کے اختتام کے موقع پر بعض اسکالرز نے اقدام کر کے بین الاقوامی قرآن کانفرنس کے نام سے ایک علمی اجتماع منعقد کیا تھا۔ اس کانفرنس کا بنیادی موضوع کچھ اس طرح تھا کہ گذشتہ چودہ سو برس میں قرآن کی تعلیمات کا تہذیب انسانی میں کیا رول رہا ہے۔ یہ اجتماع امید سے زیادہ کامیاب رہا اور اس کامیابی کا سہرا دنیا کے ان تمام ممتاز مسلم اور غیر مسلم دانشوروں اور عالموں کے سر تھا جنھیں قرآن اور اس کی تعلیمات کے موضوع سے دلچسپی ہے اور جنھوں نے اس موضوع پر غور و فکر کیا ہے اور لکھا بھی ہے۔ وہیں کینبرا میں بعض اسکالرز کی طرف سے یہ خیال پیش کیا گیا کہ کیوں نہ اس کانفرنس کو ایک مستقل شکل دیدی جائے اور مشہور عالم بین الاقوامی اورینٹل کانگریس کے نہج پر جو مستشرقین کی ساختہ پرداختہ ہے، اس کی باضابطہ تشکیل کر کے اسے بھی کانفرنس کے بجائے کانگریس کہا جائے۔ کینبرا ہی میں جناب حکیم عبدالحمید صاحب (متولی ہمدرد فاؤنڈیشن، دہلی) کے شوق اور ایما پر یہ طے پایا کہ اس کانگریس کا دوسرا اجلاس انھیں کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز کے زیر اہتمام دسمبر ۱۹۸۲ء میں دہلی میں ہوا۔ چنانچہ دہلی میں (ہمدرد نگر، تغلق آباد) یہ اجلاس دوسری بین الاقوامی قرآن کانگریس کے عنوان سے ۱۲ دسمبر سے ۱۷ دسمبر ۸۲ء تک منعقد ہوا۔

حکیم عبدالحمید صاحب کے ہر کام میں خوش سلیقگی، حوصلہ اور حسن کی نمود ہوتی ہے مہمانوں کے قیام و طعام اور ان کے ہر طرح کے آرام کے لیے ہمدرد نگر میں اس موقع پر جس

دوسروں کے مذہبی عقائد اور دینی روایات کے موضوع پر لکھنے کی آزادی ہے۔ کسی ایک خاص مذہب کا پیرو دوسرے مذاہب کا مطالعہ کر سکتا ہے اور اپنے مطالعے کے نتائج تمام بھی کر سکتا ہے، لیکن اس سلسلے میں تصنیف و تالیف کا اولین و بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ پہلے زیر مطالعہ مذہب کے پیروؤں کے عقائد پوری وضاحت کے ساتھ، مکمل طور پر اس طرح بیان کر دیئے جائیں کہ اس شکایت کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے کہ ان کے عقائد کو غلط طور پر یا توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ اب اگر لکھنے والا کسی اور نظریے یا عقیدے کا حامل ہے اور وہ اپنے نظریے یا کسی اور نظریئے کا ذکر کرنا چاہتا ہے تو اسے اس کا حق حاصل ہے لیکن اُسے چاہیئے کہ وہ اپنے یا کسی دوسرے کے نظریئے کو الگ سے، پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرے۔

افسوس ہے کہ سنجیدہ اور بالغ نظر مستشرقین بھی قرآن پاک اور سیرت اقدسؐ پر لکھتے وقت اس بنیادی اصول کو عام طور پر فراموش کر دیتے ہیں اور کچھ اس طرح کا غلط مبحث کرتے ہیں کہ صرف وہی لوگ جن کا اسلام کا مطالعہ اچھا ہے، یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ لکھنے والا اپنے ذاتی خیال اور عقیدے کو اپنے قاریوں کے ذہن میں اتار دینا چاہتا ہے۔ تاریخی معروضیت اور مذاہب کے تقابلی مطالعے کے چند بنیادی تقاضے ہیں، لیکن عام طور پر مستشرقین کا حال یہ ہے کہ اُن کی "یہودیت" یا "مسیحیت" ان بنیادی تقاضوں پر غالب آجاتی ہے، تاریخی معروضیت کے بلند بانگ دعوؤں کے باوجود مغربی مصنفین دوسرے مذاہب اور تمدنوں کے بارے میں اتنے بھی معروضی نہیں جتنا کہ آج سے صدیوں پہلے ابوریحان البیرونی نام کا وہ مسلمان عالم اور دانشور تھا جس نے الآثار الباقیہ اور کتاب الہند لکھ کر تاریخی معروضیت اور مذاہب کے تقابلی مطالعے کی صحیح راہ متعین کر دی تھی۔

اپریل ۱۹۸۲ء

اِلورین اِلورین، نائیجیریا)، مسٹر اے کے۔ بروہی (اسلام آباد، پاکستان)، حکیم محمد سعید (ہمدرد فاؤنڈیشن، نظام آباد، کراچی)، ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا (اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اسلام آباد، پاکستان) پروفیسر حسن محمد بجودہ (ام القریٰ یونیورسٹی، مکہ معظمہ، سعودی عرب) ڈاکٹر غلام محمد کریم (پیتھال، جنوبی افریقہ)، ڈاکٹر عدنان زرزور (یو۔ اے۔ یونیورسٹی، العین، متحدہ عرب امارات)، پروفیسر ٹی۔ بی۔ اِرونگ (امریکہ)، پروفیسر الفرڈ۔ ٹی۔ ویلش (مشیگن اسٹیٹ یونیورسٹی، مشیگن، ریاستہائے متحدہ امریکہ) اور پروفیسر اسمٰعیل۔ کے۔ پوناوالا (یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، لاس انجلیز، ریاستہائے متحدہ امریکہ)۔

قرآن میں اللہ کی باتیں ہیں اور اللہ کی باتیں کبھی ختم نہیں ہوسکتیں، اسلام کی چودہ صدیوں میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرا کہ قرآن کریم سے بے اعتنائی و بے توجہتی برتی گئی ہو۔ قرآن نے اپنے پیغام کے ذریعہ تاریخ انسانی میں ایک انقلاب برپا کردیا، اس انقلاب کی کار فرمائی آج بھی جاری ہے اور مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق قیامت تک جاری رہے گی، یہی وجہ ہے کہ باوجود اس کے کہ بعض لوگوں نے اس وحی الٰہی کو تاریخ کا محض ایک واقعہ کہہ کر دنیا کو ایک قصۂ پارینہ باور کرانا چاہا، مسلم دنیا کیا، غیر مسلم دنیا بھی اس کی طرف متوجہ ہے اور اللہ کی اس کتاب کو پڑھتی اور اس کے پیغام کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کرتی ہے۔

قرآن نے اپنے ماننے والوں کے دل میں علم و تلاش، اور تفکر و تدبر کا جو شوق پیدا کردیا تھا اُس نے ریگ زاروں کو گلستاں بنادیا، تہذیب و تمدن کی ایسی شمعیں روشن کیں کہ دنیا کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھٹ گیا اور امید و نشاط کی چاندنی پھیل گئی۔ قرآن نے انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دی اور بنی نوع انسان کو ایک کنبہ قرار دے کر اخوت و مساوات کا سبق دیا، قرآن نے بتایا کہ انسان اس کائنات کی تسخیر کرسکتا ہے، یہ اسی کے لئے بنائی گئی ہے، اس لئے اس کی کوئی چیز ایسی نہیں جس کے آگے اس کا سر جھکے، یہ کائنات اسے سلام کرتی ہے اور اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے خالق اور خالقِ کائنات کی عبادت کرے، صرف اسی کو سجدہ کرے اور اس طرح "ہزار سجدوں" سے اپنے آپ کو محفوظ کرلے۔

یوں تو ایک ایسی کتاب کا مطالعہ اور اس کے پیغام پر غور و فکر اسی شخص کے قلب و نظر

پیمانے کا انتظام دیکھنے میں آیا، اس کی نظیر ذرا کم ہی ملے گی، اپنی جگہ خود وہ وسیع احاطہ (کیمپس) جس میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز کی خوش نما عمارت کے علاوہ جو بیک وقت صلابت و نزاکت دونوں کی حامل ہے اور اس تناسب و موزونیت کے ساتھ حامل ہے کہ آپ اپنی ایک منفرد اور حسین عظمت رکھتی ہے، ایک خوبصورت مسجد، مجیدیہ اسپتال، طبی تحقیقات کا انسٹی ٹیوٹ، طبیہ کالج، ہمدرد پریس، ہوسٹل، مہمان خانہ اور رہائشی مکانات کی صاف ستھری اور خوشنما عمارتیں ہیں، ایک ایسی بستی بن گئی ہے جسے دیکھ کر کوئی یہ باور نہیں کر سکتا کہ ابھی پندرہ بیس برس پہلے یہ ایک ایسا خرابہ رہا ہو گا جس کا عبرتناک منظر آج بھی پاس ہی میں قلعہ تغلق آباد کی سنسناتی، ویرانی اور ہیبتناک خاموشی پیش کرتی ہیں ــــ کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد، ہمدرد نگر کی یہ خوبصورت بستی اس مصرع کی جیتی جاگتی اور بولتی ہوئی تصویر ہے۔

اسی تازہ اور شاداب بستی میں دانشوروں اور عالموں کا یہ بین الاقوامی اجتماع قرآن کے موضوع پر منعقد ہوا جس کا پیغام ہمیشہ تازہ اور تازہ کار، شاداب اور شاداب کار رہے گا۔ اس اجتماع کا بنیادی موضوع بحث یہ تھا: "قرآن پندرہویں صدی ہجری میں" اور اس میں مختلف ملکوں کے کوئی اٹھتّر مندوب شریک ہوئے اور ہندوستان کے علاوہ آسٹریلیا، بنگلہ دیش، کناڈا، انگلستان، انڈونیشیا، لیبیا، نیدرلینڈ، نائیجیریا، پاکستان، سعودی عرب، جنوبی افریقہ، ترکی، متحدہ عرب امارات اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے اسکالرز نے قرآن اور قرآنی مطالعات کے مختلف پہلوؤں پر مقالے پیش کئے۔ کچھ بحث و مباحثہ بھی رہا لیکن سب علمی انداز میں۔ باہر سے جن حضرات نے شرکت کی ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:
ڈاکٹر احمد سبول (یونیورسٹی آف سڈنی، آسٹریلیا)، ڈاکٹر تفیض الرحمن (ڈھاکہ یونیورسٹی، بنگلہ دیش)، پروفیسر خالد بن سعید (کوینس یونیورسٹی کنگسٹن، کناڈا)، ڈاکٹر ارل، ایچ، واگ (یونیورسٹی آف البرٹا، البرٹا، کناڈا)، ڈاکٹر کینیتھ کریگ (انگلستان)، پروفیسر آر، بی، سارجنٹ (کیمبرج یونیورسٹی، انگلستان)، پروفیسر مونٹگمری واٹ (ایڈینبرا یونیورسٹی، اڈینبرا، انگلستان)، پروفیسر بالجون (یونیورسٹی آف لائیڈن، نیدرلینڈ)، پروفیسر اسمٰعیل بالوگن (یونیورسٹی آف

سید قطب کی بعض تصریحات میں ایسا ہی غلو ملتا ہے۔ ہم نے ایک نجی گفتگو میں جب اس موضوع پر ان کا خیال معلوم کرنا چاہا تو انھوں نے اعراض سے کام لیا اور ہم نے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

پروفیسر بالجوں کے مقالے کا عنوان تھا: "شاہ ولی اللہ اور قرآن"۔ لیکن اپنے مقالے کے موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے انھوں نے ایک پرانا قصّہ چھیڑ دیا اور کہا کہ "کتاب مقدس اپنی اصل میں غیر مخلوق (قدیم) ہے اور اپنے نزول اور عربی زبان میں وحی کیے جانے کے لحاظ سے مخلوق ہے۔ اس کا اعلیٰ ترین ادبی اسلوب پیغمبر اسلامؐ کی عملی زندگی کے تاریخی پس منظر ہی میں اپنی معنویت رکھتا تھا"۔ اس کے بعد پروفیسر موصوف نے شاہ صاحبؒ کی ترجمانی اس طرح کی ہے کہ "شاہ ولی اللہ اسے پسند نہیں کرتے کہ اس مقدس کتاب (قرآن) میں جس بات کا اظہار مقصود ہے اس سے زیادہ کچھ اور دیکھا جائے"۔ اب پروفیسر بالجوں کی پہلی بات کو پھر غور سے پڑھیے اور شاہ صاحبؒ سے منسوب ٹکڑے کو دیکھیے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ بنیادی طور پر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم کا پیغام صرف ایک عہد کے لیے تھا۔ جہاں تک شاہ صاحب کی بات کا تعلق ہے ہمارے خیال میں وہ قرآن کریم کی آیات کی ایسی تفسیروں کے بارے میں تھی جو بعض صوفیہ سے منسوب تھیں۔ عہد وسطیٰ میں صوفی حلقوں کی طرف سے قرآن کی تفسیر ایسے انداز میں کی جانے لگی تھی جو کتاب و سنت سے میل نہیں کھاتی تھی۔

ڈاکٹر کینتھ کریگ نے اپنے مقالے میں "ایک اہم سوال اٹھایا ہے اور انھوں نے قرآن کی اس آیت کریمہ پر غور و فکر اور تبادلۂ خیال کی دعوت دی ہے:

وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِيْنَ (سورۂ واقعہ ۶۰ اور سورہ معارج ۴۱)

درحقیقت سورہ واقعہ اور سورۂ معارج کی مذکورہ آیات علی الترتیب اس طرح ہیں:

۱۔ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِيْنَ ۙ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ ۲۔ فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۙ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا

کے لیے مفید ہو سکتا ہے اور اس سے اسی کو روشنی اور ہدایت مل سکتی ہے جو اسے اللہ کی کتاب مانتا ہو اور اس کا عقیدہ ہو کہ یہ کلام الٰہی ہے۔ لیکن یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے اور اس کا تجربہ ہوتا رہتا ہے کہ آج بھی عقلیت اور سائنس کی ترقی کے اس دور میں اُس شخص کو بھی ہدایت ملتی ہے جسے حق کی تلاش ہو۔ جو شخص دیانتداری کے ساتھ حق اور سچائی کا متلاشی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ خود اُسے اپنی راہ دکھا دیتے ہیں۔

بین الاقوامی قرآن کانگریس کے اس دوسرے اجلاس میں قرآن کے مختلف پہلوؤں سے متعلق جو مقالے پڑھے گئے، وہ اپنے تنوع کے لحاظ سے خاصے دلچسپ اور معلومات افزا تھے، اور ان سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب کے اہل قلم کس کس زاویے سے اللہ کی کتاب کو دیکھتے اور اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ذیل میں نمونے کے طور پر چند مقالوں کی خاص خاص باتیں درج کی جاتی ہیں:

ڈاکٹر احمد سبول کا خیال ہے کہ مصر کے مشہور اخوانی لیڈر اور اہل قلم سید قطب مرحوم کا طرز فکر بالکل نیا تھا اور انھوں نے قرآن کو جس طرح سمجھا اور سمجھانا چاہا اس کی مثال گذشتہ صدیوں میں کسی مفسر قرآن کے یہاں نہیں ملتی، قرآن کے نظریۂ کائنات اور اس کے فکری، روحانی اور عملی تصورات کو انھوں نے قرآن ہی کے فریم ورک میں سمجھنے کی کوشش کی اور یہ بالکل ایک نئی بات تھی۔ ڈاکٹر سبول کا کہنا ہے کہ پہلے جو تفسیریں لکھی گئیں اُن میں کسی ایک خاص پہلو ہی کو اجاگر کیا گیا، سید قطب نے قرآن کو ایک "کُل" کی صورت میں دیکھا اور اس کے ہمہ گیر تعلیمات کو اسی ہمہ گیری کے ساتھ پیش کیا۔ ڈاکٹر احمد سبول اخوانی ہیں، اسی لیے سید قطب مرحوم کے لیے ان کے یہاں ایک جوش عقیدت ملتا ہے۔ اس کے علاوہ غالباً انھیں اس کا علم نہیں کہ قرآن کی تفہیم و تشریح کے سلسلے میں وہ جس نئے انداز فکر کو صرف سید قطب مرحوم سے منسوب کرتے ہیں، اُسے عصر حاضر میں دوسرے مفسرین و شارحین نے بھی اپنایا ہے، اور یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ جو انداز فکر نیا ہو وہ ہر لحاظ سے معتبر بھی ہو، مثال کے طور پر اللہ کی حاکمیت کو الوہیت و ربوبیت کا اخص خصائص کہنا محل نظر ہے اور اس سے ہندوستان اور مصر کے معتبر اور اہل نظر علما نے اختلاف کیا ہے۔

شکل میں نمود کرتی رہتی ہے۔ کریگ نے مذکورہ بالا آیاتِ قرآنی کو اسی زاویۂ نگاہ سے سمجھنے کی کوشش کی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی ان کی اس کوشش میں شریک ہوں۔

کینیتھ کریگ کا طرزِ فکر بڑی اچھی مثال اس امر کی ہے کہ بعض مغربی اسکالرز قرآن کو کس طرح پڑھتے اور سمجھتے ہیں۔ ہمارے خیال میں تاریخ کے تغیرات و انقلابات کے رشتے کو "تقدیرِ الٰہی" سے جوڑنے کا نظریہ مسلمانوں کے لیے نیا نہیں ہے، قرآن کا نظریۂ تاریخ یہی ہے، مسلمان اس پر یقین رکھتے ہیں لیکن دنیا کی تاریخ اور خود اپنی تاریخ کو اس قرآنی نظریۂ تاریخ کی روشنی میں سمجھنے کی کوئی معتبر اور معقول کوشش آج مسلمانوں میں نظر نہیں آتی، اور اگر کہیں ہے تو اس مسئلہ کو وہ اہمیت حاصل نہیں ہے جس کا کہ یہ مستحق ہے۔

پروفیسر آر۔ بی۔ سارجنٹ نے اپنے مقالے میں مغربی اسکالرز کے اس طرزِ فکر سے بحث کی ہے کہ قرآن کریم اولین اہمیت کی ایک تاریخی دستاویز ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ مغرب کے اسکالرز جو مسلمان نہیں ہیں وہ یقیناً قرآنی مطالعات سے مختلف زاویۂ نظر رکھتے ہیں لیکن خاص بات یہ ہے کہ آج کل یہ زاویۂ نظر معروضی، اور اکثر ہمدردانہ ہوتا ہے، البتہ کچھ مستثنیات بھی ہیں جن کے یہاں غیر عالمانہ جانبداری یا تعصب پایا جاتا ہے۔ مغربیوں کے نزدیک قرآن ایک بڑی اہم تاریخی دستاویز ہے جو اتنی پیچیدہ ہے کہ اس کی تنقیح و وضاحت کے سلسلے میں بڑے اختلافات ہیں۔ قرآن کے اس پہلو سے متعلق مسلمان عالموں نے خود بڑی چھان بین کی اور ابن اسحاق اور دوسرے اربابِ علم نے "اسبابِ نزول" کے موضوع پر بہت کچھ لکھا۔ گذشتہ چند دہوں میں جزیرۃ العرب میں کئی چیزوں کا کھوج لگایا گیا ہے، خصوصاً مآرب اور نجران وغیرہ کے علاقے میں سائنٹفک آرکیولوجی کی مدد سے قبل از اسلام عرب کے اس تمدنی ماحول کو دریافت کر لیا گیا ہے جس میں پیغمبر اسلامؑ نے آنکھیں کھولیں، پروان چڑھے اور ان پر وحیِ الٰہی کا نزول ہوا۔ مزید براں اب ایسے ہزاروں کتبات چھپ گئے ہیں جنھیں آج کے اسکالرز نے بڑی صحت کے ساتھ پڑھا اور سمجھا ہے۔ سارجنٹ کے قول کے مطابق ان کتبات میں اللہ کی بہت سی قرآنی صفات کا

مِّنۡهُمۡ وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِيۡنَ ○ سورۂ واقعہ میں کہا گیا ہے کہ "ہم ہی نے تمہارے درمیان موت کو (معین وقت پر) ٹھہرا رکھا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری جگہ تمہارے جیسے اور (آدمی) پیدا کر دیں اور تم کو ایسی صورت میں بنا دیں جس کو تم جانتے ہی نہیں"۔ سورۂ معارج کی مذکورہ آیت کا ترجمہ یہ ہے: "میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے مالک کی کہ ہم اس پر قادر ہیں کہ (دنیا ہی میں) ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں (یعنی پیدا کر دیں) اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں"۔ اور دونوں آیتوں میں تاکید کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "ہم عاجز نہیں ہیں"۔

کینیتھ کریگ نے خدا کی اسی قدرت کاملہ کی طرف جس سے زمان و مکان کے تمام تغیرات وجود میں آتے ہیں، توجہ دلائی ہے اور عصر حاضر کے بے پناہ دکھ درد کے پس منظر میں خدا کی قدرت اور خدا پر ایمان و ایقان کی ماہیت و اہمیت اور انسانی زندگی پر ان کے اثرات کو سمجھنے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ان کے خیال میں وہ علوم اور ہنر ندیاں جن کی بنا پر بعض لوگ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ صرف آدمی ہی سب کچھ ہے، خدا ہی کی عطا کی ہوئی ہیں اور خود انسان کیا ہے؟ اس ارض خدا کی پر خدا کا "نمایندہ" جو اس کا بندہ بھی ہے۔ اس لئے خدا کی ہستی سب سے بالاتر ہے۔ دین کی مختلف ہیئتوں کے باوجود وہ عاجز نہیں ہے۔ ہیئتیں، صورتیں، ادارے اور ان کی ساختیں مذہبی زندگی کے ساتھ لگی رہتی ہیں لیکن جب یہ صورت ہو جائے کہ چونکہ یہ سب کچھ فی سبیل اللہ ہے اس سے انھیں کو سارے اختیارات اور ساری اتھارٹی حاصل ہے، تو پھر عبادت اور بندگی کا تصور کمزور ہو جاتا ہے۔ خدا "جہاد فی سبیل اللہ" کی حدوں میں مقید نہیں ہے۔ سمیا "قیود دین کی ہر سعی اور مذہب کی ہر جد و جہد میں ذات الٰہی ہی کا سایہ اپنے اوپر دیکھتا ہے۔ کریگ نے اپنے مقالے میں یہ بھی کہا کہ "انسان کے موجودہ المیے" میں بھی خدا عاجز اور بے بس نہیں ہے۔ ہمارے لئے سوچنے کی بات یہ ہے کہ تاریخ انسانی میں اثبات عدل الٰہی کا ظہور کس کس طرح ہوتا رہا ہے اور یہ حقیقت کہ اُس ظلم کی تمام ہیبتناکیاں جسے انسان اپنی عارضی طاقت کی بنا پر روا رکھتا ہے خدا کے بے پناہ وسائل کے مقابلے میں ہیچ ہیں، انسانوں کی دنیا میں کس کس

# یونیفکیشن چرچ

# ایک نیا عیسائی فرقہ

ہم میں کم لوگ ایسے ملیں گے جو عیسائیوں کے ایک نئے فرقے یعنی یونیفکیشن چرچ، اس کی تاریخ اور اس کے معتقدات سے واقف ہوں، میں خود بھی جنوری ۱۹۸۳ء سے پہلے اس سے ناواقف لوگوں میں تھا۔ جنوری ۱۹۸۳ء کے پہلے ہفتہ میں امریکہ کی ریاست فلوریڈا ایس میامی کے قریب ساحل سمندر پر واقع فورٹ لاڈرڈیل کے پُرسکون چھوٹے سے شہر میں یونیفکیشن تھیولوجیکل سیمنری کی طرف سے ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مجھے شریک ہونے کا موقع ملا۔ اس کانفرنس کا موضوع تھا: GOD: THE CONTEMPORARY DISCUSSION، یعنی عصر حاضر میں تصور خدا سے متعلق جو بحثیں ہو رہی ہیں، وہ کیا ہیں اور کس طرح مختلف ملکوں میں انسانوں کی زندگیوں کو متاثر کر رہی ہیں۔ شرکت کرنے والوں میں مختلف علوم کے لوگ تھے، جیسے مذہب، فلسفہ، سوشیولوجی، تاریخ وغیرہ۔ دنیا کے بڑے مذاہب کی نمائندگی کرنے والے بھی تھے اور عیسائی مذہب کے مختلف چرچ کے نمائندے بھی، غرض کوئی ڈیڑھ سو مندوبین اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔

کانفرنس میں معلوم ہوا کہ عیسائی دنیا یونیفکیشن چرچ کو ایک ایسی بدعت سمجھتی ہے جس نے عیسائیت کے مستند و مسلّمہ عقائد پر کاری ضرب لگائی ہے، اور اسی لئے ہر طرف سے اس کی شدید مخالفت ہو رہی ہے۔ قبل اس کے کہ اس فرقے کے بعض عقائد بیان کئے جائیں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس فرقے کے بانی سُن می اُنگ مُون کے حالات زندگی جو عام طور پر ریورنڈ مُون کے نام سے مشہور ہیں، مختصراً بیان کر دیئے جائیں۔ معاملے

ذکر ملتا ہے، مثلاً، 'مالکِ یوم الدین' اور 'تعالیٰ' وغیرہ جو اللہ کے لفظ کے ساتھ بولا اور لکھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کتبات سے چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کی عرب تاریخ سے متعلق بہت کچھ معنی خیز معلومات بھی ملتی ہیں

سارجنٹ کی ان باتوں سے صاف صاف اندازہ نہیں ہوتا کہ آخر ان کا منشار کیا ہے اور جزیرۃ العرب میں اثریاتی تلاش وتحقیق کے نتائج سے وہ کیا نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں۔ شاید وہ بھی اسی نظریئے کے قائل ہیں کہ قرآن کریم محض ایک اہم تاریخی دستاویز ہے! لیکن علمی انداز نظر تو یہ ہوگا کہ وہ اپنے مطالعے اور غور وفکر کو ذرا اور وسیع کریں۔ کیا عجب کہ اثریاتی دریافت سے ہی وہ اس نتیجہ پر پہونچ جائیں کہ قرآن ایک ایسی الہامی کتاب ہے جو اسلام سے پہلے کے دین اور مقدس صحیفوں کی تصدیق کرتی ہے، اس لئے اسلام ہی وہ سچا دین ہے جس کی اشاعت مختلف ادوار میں مختلف انبیائے کرام نے کی تھی اور جو اپنی غیر محرف خالص صورت میں قرآن حکیم میں موجود ہے۔

آخر میں ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ابھی علم وتحقیق، اظہار خیال اور انداز بیان، غرض ہر لحاظ سے مسلمان عالموں اور دانشوروں کے مقابلے میں مغرب کے اسکالرز کہیں آگے ہیں۔ اس اجتماع میں مسلم مقالہ نگاروں میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جن کے مقالوں میں غیر ضروری "جذباتیت" یا خواہ مخواہ کے معذرتی انداز بیان اور طرز فکر سے کام لیا گیا تھا۔ ہم اسے تسلیم کرتے ہیں کہ عقیدہ آدمی کو قدرے جذباتی بنا دیتا ہے، لیکن ایسا بھی ممکن ہے کہ عقیدہ کے ساتھ علمی طرز بیان اور معروضی نقطۂ نظر کا امتزاج ہو جائے، کیونکہ مجرد معروضیت کسی کے بس کی بات نہیں، چاہے وہ مغرب کے اسکالرز ہوں یا مشرق کے۔ البتہ علمی انداز نظر لکھنے والے کو معذرتی لہجے، بیجا جذباتیت اور غیر ضروری خطابت سے محفوظ رکھتا ہے اور اس سے موضوع زیر بحث سے متعلق استدلال واستنباط کا وزن بہت بڑھ جاتا ہے۔

جنوری ۱۹۸۳ء

مون نے اپنا مشن ایک گہرے جذبے اور جوش سے شروع کیا۔ پیونگ یانگ میں جہاں عیسائیوں کی خاصی آبادی تھی اور جسے لوگ کبھی کبھی مشرق کا یروشلم بھی کہتے تھے، اُن کے مشن کی مخالفت ہوئی، ان کے عیسائی مخالف ان پر عیسائی روایات اور عیسائیت کے مسلمہ عقائد سے بغاوت کا الزام لگاتے تھے اور کہتے تھے کہ خدا کی حکومت کا کوئی تعلق اِس دنیا کی فلاح و بہبود سے نہیں ہے۔ دوسری طرف کمیونسٹ حکومت تھی جو اس پر تلی ہوئی تھی کہ شمالی کوریا میں مذہب کا وجود باقی نہ رہے اور وہاں آمرانہ طرز کی سیکولر سوسائٹی کو فروغ حاصل ہو۔ شمالی کوریا میں مؤن کو قید و بند کی زندگی بھی گذارنی پڑی اور انھیں کمیونسٹ حکومت کے ایک ایسے کیمپ میں بھی رہنا پڑا جہاں حکومت سے اتفاق نہ کرنے والوں کو جبریہ محنت مزدوری کرنی پڑتی تھی۔ ایسے کیمپوں میں زیادہ تر لوگ زندگی کی مصیبتوں سے ہمیشہ کے لیئے نجات حاصل کر لیتے ہیں، لیکن مؤن نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ زندہ رہیں گے، اس لیئے ناقابل برداشت حالات کے باوجود وہ زندہ رہے یہاں تک کہ تین برس بعد جب ۱۹۵۰ء میں یو۔این۔او کی افواج نے قیدیوں کو آزاد کرایا تو مؤن بھی اپنے چند پیروؤں کے ساتھ جنوبی کوریا چلے گئے۔ بعد میں اپنے قیدخانے کے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے مؤن نے ایک بار کہا تھا: "میں نے کبھی شکایت نہیں کی اور نہ کسی کمزوری کی بنا پر دعا مانگی۔ میں نے کبھی خدا سے مدد بھی نہیں چاہی۔ اس کے بجائے میں اُسے اپنی طرف سے اطمینان دلاتا رہا کہ وہ میرے لیئے پریشان نہ ہو۔ چونکہ خدا کو خود میرے مصائب کا علم تھا، مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ میں اُس کو اپنی مصیبتیں یاد دلاؤں، تقاضا کروں اور میری وجہ سے اُسے اور دُکھ اٹھانا پڑے۔ میں نے اس سے صرف یہی کہا کہ میں کبھی ہار نہیں مانوں گا۔"

۱۹۵۳ء میں مؤن پوسان سے جنوبی کوریا کی راجدھانی سیول آ گئے جہاں انھوں نے اگلے برس باضابطہ "ہولی اسپرٹ ایسوسی ایشن فور دی یونیفکیشن آف ورلڈ کرسچانٹی" کے نام سے ایک نئی عیسائی تنظیم کی بنیاد ڈالی جس نے اب باقاعدہ ایک الگ چرچ کی شکل اختیار کر لی ہے اور دنیا میں یونیفکیشن چرچ کے نام سے مشہور ہے۔ شمالی کوریا میں مؤن

کی کئی گرہیں خود بخود اس سے کھل جائیں گی ۔

ریورینڈ مُون شمالی کوریا کے ایک گاؤں جیونگجو میں ۶ جنوری ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والدین عیسائی اور پریسبائیٹرین چرچ کے پیرو تھے۔ کوریا کی مذہبی تاریخ بڑی دلچسپ ہے اور خود کوریائی عیسائیت کی داستان بھی کم دلچسپ اور اہم نہیں ہے، لیکن اس کے بیان کا یہ موقع نہیں، مُون کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ بچپن ہی سے ان میں یہ وصف نمایاں تھا کہ وہ ناانصافی یا دوسروں پر کسی قسم کی زیادتی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ان کی قوت ارادی بھی ان کے مزاج کی ایک خصوصیت تھی۔ انھوں نے ایک بار اپنے ایک عقیدت مند کو بتایا کہ جب وہ بارہ برس کے ہوئے تو انھیں جنگلوں کی تنہائی میں عبادت میں بڑا مزہ آتا، ایک دن انھیں ایسا محسوس ہوا کہ درخت، جھاڑیاں اور گھاس پھوس، سب ان سے کہہ رہے ہیں: "کوئی ہماری پروا نہیں کرتا، ہمیں انسان نے بھلا دیا ہے۔" اور اس کا جواب ان کی طرف سے یہ تھا: "گھبراؤ نہیں، میں تمہاری خبر گیری کروں گا۔" ایک اور موقع پر ان کی یہ دعا تھی: "اے میرے باپ، مجھے (حضرت) سلیمان سے زیادہ دانائی، (سینٹ) پال سے زیادہ ایمان اور (حضرت) عیسیٰ سے زیادہ محبت عطا کر۔" ۱۹۳۶ء میں جب مُون کی عمر ۱۶ سال تھی، ایسٹر کی صبح کو جب وہ ایک پہاڑی کے دامن میں عبادت میں محو تھے، انھیں محسوس ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ ان کے سامنے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ دو ہزار برس پہلے انسانیت کو اس کے صحیح مقام پر لانے کا جو کام میں نے شروع کیا تھا، اُسے تمہیں پورا کرنا ہے۔

اور اب اس کے بعد مُون نے مذہبی صداقت کی تلاش شروع کر دی، اور اگرچہ وہ جاپان کی وسیڈا یونیورسٹی میں الیکٹریکل انجینیرنگ کے طالب علم بن چکے تھے، ان کی عبادت، مذہب کا مطالعہ اور انسانوں کے ساتھ خدا کے معاملات پر غور و فکر جاری رہا اور آخر کار جب وہ پچیس سال کے ہوئے تو انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ انھیں اُس چیلنج کو جو انھیں اپنے وژن میں حضرت عیسیٰؑ کے ظہور سے ملا تھا، قبول کرنا، حضرت عیسیٰ کے ادھورے کام کو پورا کرنا اور اس دنیا میں خدا کی حکومت قائم کرنا ہے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۶ء میں جب کوریا پر جاپان کا تسلط ختم ہو چکا تھا،

گفتگو کا موقع ملا۔ ان کی ملاقات مہاتما بدھ، کنفیوشس اور حضرت محمدؐ سے بھی ہو چکی ہے اور یہ کہ وہ عالم ارواح میں آزادی سے گھوم پھر سکتے ہیں اور ایک ایسا واسطہ ہیں جس کے ذریعہ اس زمانے میں وحی الٰہی لوگوں تک پہونچتی ہے۔ یونیفکیشن فکر یہ ہے کہ آج جبکہ روایتی عیسائیت سے دل برداشتہ ہوکر عیسائیوں کی ایک اچھی خاصی تعداد اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ رہی ہے، بہت سے عیسائی نئے خیالات اور عیسائیت کی نئی تعبیر کے خواہاں ہیں، اس لئے سوال یہ ہے کہ اس صورت میں جب کہ بائبل کے عقائد مشتبہ قرار دیئے جارہے ہیں، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ خدا نوع انسانی کو اپنی طرف بلانے کے لئے کوئی نئی راہ دکھائے؟ اگر آج کی دنیا میں ایسے عیسائیوں کی تعدا بڑھتی جارہی ہے جنھیں اپنے چرچ سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے، تو کیا ایسے لوگوں کی تعداد بھی نہیں بڑھی ہے جو دیانتداری کے ساتھ خدا کو پانے کے آرزومند ہیں؟ شاید مشیت الٰہی یہی ہے کہ روایتی عیسائیت کے انحطاط سے انسان کا ذہنی افق وسیع ہو، اس کی بصیرت اور گہری ہو، اور وہ کسی نئی وحی کے استقبال کے لئے ذہنی طور پر آمادہ ہو۔ یونیفکیشن فکر یہ بھی ہے کہ جس طرح بابل میں یہودیوں کی قید وبند کے المیہ کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ربیوں کی یہودیت وجود میں آئی تھی اور عہد وسطی کی عیسائی دنیا کے انتشار سے پروٹسٹنٹ اور کیتھولک ریفارمیشن کی راہ ہموار ہوئی تھی۔ اسی طرح اس کا بھی امکان ہو سکتا ہے کہ آج کی مذہبی بے اطمینانی کے سبب نظریہ نجات کی تاریخ میں ایک نئے عہد کا آغاز ہو۔

رومن کیتھولک عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ "چرچ سے باہر نجات ممکن نہیں" اور پروٹسٹنٹ کہتے ہیں کہ "بائبل میں جو کچھ ہے وہ خدا کی آخری وحی ہے"۔ لیکن عیسائی دنیا میں ایسے بھی عیسائی رہے ہیں جو انجیل میں یوحنا حواری کی کتاب کی تعلیمات کے مطابق خدا کی طرف سے موعود نئی سچائی کے ہمہ وقت منتظر رہتے تھے، مثلاً بارہویں صدی کے وسط میں جنوبی اٹلی کی ایک خانقاہ کے صدر راہب جوشیم کو اس بات کا یقین تھا کہ انسانیت کو اس کے صحیح مقام پر لانے کے لئے خدا نے ان پر اپنی وحی بھیجی ہے۔ جوشیم کے کوئی پانچ سو برس بعد جب سے فلاڈر کے "زائرین" کے سامنے ہالینڈ میں

اور ان کے پیروکمیونسٹ حکومت کے ظلم و ستم کا نشانہ تھے، جنوبی کوریا میں پرانے اور مستحکم عیسائی فرقوں نے ان کی مخالفت کی اور اس نئے فرقے کی ہر طرح مذمت کی، اس پر طرح طرح کے الزامات لگائے گئے جن میں سے ایک الزام جنسی بے راہ روی اور بد اخلاقی کا بھی تھا۔ مُون کو حکومت نے گرفتار کر لیا اور ان پر مقدمہ چلایا گیا، لیکن عدم شہادت کی بنا پر عدالت نے انھیں بری کر دیا اور وہ رہا کر دیے گئے۔ بہرحال مخالفتوں کے باوجود یونیفکیشن چرچ ترقی کرتا رہا اور اس کے عقائد کی اشاعت ہوتی رہی، اس کے مشنری جاپان اور امریکہ پہونچے اور ۱۹۷۵ء تک صورت حال یہ ہوگئی کہ ایک سو بیس ملکوں میں اس چرچ کے مشنری موجود تھے۔

۱۹۶۰ء میں ریورنڈ مُون نے ہاک۔جا۔ہان سے شادی کی تھی، ۱۹۷۲ء میں دونوں میاں بیوی امریکہ پہونچے جہاں انھوں نے گھوم گھوم کر تقریریں کیں، بہت سے لوگ اس نئے چرچ میں شامل ہو گئے جس سے مختلف عیسائی فرقوں اور یہودیوں میں بڑا اشتعال پیدا ہوا اور انھوں نے ڈٹ کر یونیفکیشن چرچ کی مخالفت شروع کر دی، یہ مخالفت آج بھی جاری ہے اور حکومت کی سطح پر بھی اس کی کوشش ہو رہی ہے کہ یونیفکیشن چرچ اور ہرے کرشنا دونوں تبلیغی تنظیموں پر پابندی عائد کر دی جائے۔ لیکن مخالفین کو کوئی کامیابی نہیں ہو رہی ہے کیونکہ امریکہ میں مذہب آزاد ہے اور مذہب کی تبلیغ و اشاعت کی آزادی بھی ہے، یوں بھی امریکہ ایک اباحتی سوسائٹی ہے۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ایک وژن میں حضرت عیسیٰ نے ظہور فرما کر ریورنڈ مُون کو بشارت دی کہ دو ہزار پہلے جو کام انھوں نے شروع کیا تھا، اُسے انھیں اب پورا کرنا ہے، وہ اس بشارت کو وحی سے تعبیر کرتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ DIVINE PRINCIPLE میں اُن کے جو ملفوظات درج ہیں، وہ درحقیقت وہ وحی الٰہی ہے جو ان پر وقتاً فوقتاً نازل ہوتی رہی ہے۔ ریورنڈ مُون یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کو ایسے وژن بھی ہوئے ہیں جن میں انھیں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ حضرت موسیٰؑ اور انجیل مقدس کے رجال منتخبہ مثلاً پطرس، پال اور یحییٰ وغیرہ سے براہ راست

گناہ اولیں (گناہ آدم)، نظریۂ نجات، حضرت عیسیٰ کے "مسیح موعود" ہونے کا عقیدہ وغیرہ اس طرح گویا یہودی۔ عیسائی عقائد جن اصطلاحوں میں بیان کئے گئے ہیں، انھیں یہ نیا چرچ اور اس کی مقدس کتاب تسلیم کرتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے پیچھے جو بنیادی نظریئے ہیں، انھیں بھی یہ مانتی ہے: خدا خالق ہے۔ اس لئے مادی دنیا اچھی ہے نہ کہ بُری، انسان کے جسم اور روح میں کوئی اساسی دوئی نہیں ہے۔ خدا شخصی ہے، لاشخصی نہیں، ایک ایسا باپ جو محبت کرتا ہے اور محض ایک مابعد الطبیعی وجود مطلق نہیں ہے۔ زمان حقیقت اور اور معنی خیز ہے، فریب نہیں۔ ارضی علائق اپنی جگہ اہم ہیں اور انسان کی سماجی ذمہ داریوں کا تعلق ہم سے بھی ہے اور خدا سے بھی ہے۔ تاریخ کی تشریح متدائر کے بجائے خطی لحاظ سے درست ہے کیونکہ کائنات کی تخلیق سے جو مقصد تھا خدا اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیئے تاریخ ہی میں اپنی قدرت کا اظہار فرماتا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود DIVINE PRINCIPLE کی بعض تشریحات نئی ہیں، مثلاً بعض جدید عیسائی متکلمین کے برخلاف اور کالوِن کی طرح یہ کتاب حضرت آدم اور حضرت حوا کی انجیلی داستان کو صحیح سمجھتی ہے، اور اسی طرح زمین پر حکومت الٰہیہ کے قیام کی امید رکھتی ہے۔ کالوِن کے برخلاف اور بعض جدید متکلمین کی طرح اس کتاب میں سینٹ آگسٹائن کے نظریۂ قضا و قدر کی نفی کی گئی ہے اور حضرت عیسیٰ کے قبر سے اٹھنے کے واقعہ کو روحانی "رستخیز" کہا گیا ہے، یہ جسمانی "رستخیز" کی قائل نہیں۔ غرض کہ عیسائیت کی تاریخ میں اس طرح کی تشریحات کوئی عجوبہ نہیں، پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے اور آیندہ بھی ہوتا رہے گا، اس لحاظ سے عیسائی عقائد کی باضابطہ تشریحات اور DIVINE PRINCIPLE میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ لیکن شاید "نئی وحی" کا فقرہ روایتی طرز کے عیسائیوں کے نزدیک ایک ایسی بدعت ہے جس کا کوئی عقلی جواز نہیں۔

گناہ آدم یا فطری معصیت، تخلیق کائنات اور حضرت عیسیٰ کے ظہور ثانی وغیرہ دینیاتی مسائل سے متعلق نئی تشریحات کے ساتھ ایک اور دلچسپ بات یونیفکیشن چرچ کی جانب سے کہی جاتی ہے، اور یہ بات DIVINE PRINCIPLE میں بھی کہی

پادری جون روبنسن نے الوداعی وعظ کہا تو انھوں نے یہ بھی کہا "یاد رکھو، لوتھر اور کالون کی تعلیمات سے آگے نکل جانے میں کبھی کسی قسم کا کوئی خوف محسوس نہ کرو کیونکہ خدا کے پاس نور کا ایسا ذخیرہ ہے جس سے اس کے کلام پر ہمہ وقت نئی روشنی پڑتی رہتی ہے۔" پھر انیسویں صدی میں روس کی سلاوی تحریک کے مذہبی فلسفیوں نے اس بات کی اشاعت کی کہ عیسائیت کی ترقی کی راہ میں تین مرحلے ہیں: ۱۔ رومن کیتھولک چرچ سینٹ پیٹر کی عیسائیت کا ترجمان ہے جس میں سب سے زیادہ زور "فرمانبرداری" پر دیا جاتا ہے، ۲۔ پروٹسٹنٹزم سینٹ پال کے عیسائی عقیدہ کا علمبردار ہے جو "ایمان" پر اصرار کرتا ہے اور ۳۔ وقت آئے گا کہ ایک نئی عیسائیت، اپنی وسیع شکل میں، جنم لے گی۔ یہ عیسائیت مشرق کے چرچ سے ظہور پذیر ہوگی اور سینٹ جون سے اس کو فیضان حاصل ہوگا۔ اس کی امتیازی خصوصیت محبت کا وہ روحانی تجربہ ہوگا جس میں انسان اور خدا اور انسان اور انسان کا اتحاد قائم ہوگا۔ پس ان شواہد کی روشنی میں کیا آج یہ ممکن نہیں ہے کہ بہت سے انسان "نئی روشنی" کے انتظار میں ہوں۔

یونیفکیشن چرچ والوں کا کہنا ہے کہ بائبل خود یہ دعویٰ نہیں کرتی کہ وہ خدا کی آخری وحی یا حرف آخر ہے۔ تورات اور انجیل دونوں میں اس کا ذکر ہے کہ ایک نبی آئے گا جو ان باتوں کے علاوہ جو بتا دی گئی ہیں اور باتیں بھی بتائے گا۔ اس طرح بائبل گویا خود اس کی قائل ہے کہ وحی کا سلسلہ جاری رہے گا۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ خالص عیسائی روایت اور عیسائی یہودی تعصب کو برقرار رکھتے ہوئے یونیفکیشن چرچ بھی بعثت محمدیؐ اور قرآن کریم کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیتا ہے، اور چونکہ اسے ریورنڈ مُون کو نبی یا "مسیح موعود" ثابت کرنا ہے، اس لئے سارے دلائل کا رجحان یہی ہے کہ انیسویں صدی میں مشرق بعید میں وہ ایک شخص پیدا ہوگا جسے خدا اپنی وحی کے نزول کے لئے منتخب کرے گا۔

یونیفکیشن چرچ کی نئی انجیل DIVINE PRINCIPLE میں اسلوب بیان اور بنیادی تصورات وہی ہیں جن سے عیسائی واقف ہیں۔ مثلاً تخلیق، ہبوط آدم،

# "عربوں کا عروج وزوال"

ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر گری لال جین ایک مشہور صحافی ہیں اور قومی اور بین الاقوامی موضوعات پر ان کے تبصرے اور تجزیے دلچسپی اور توجہ سے پڑھے جاتے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ان کی رائے سے ہمیشہ ان کے قاریوں کو اتفاق ہو، یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کبھی کبھی وہ اپنی صحافی ذمہ داریوں کو بھلا کر ایسی بات بھی لکھ دیتے ہیں جو غیر جانبدارانہ نہیں ہوتی اور جس سے اُن کے تحفظات ذہنی کی پردہ دری بھی ہوتی ہے۔ خاص طور پر مسلمانوں اور عربوں کے مسائل اور ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات سے متعلق وہ ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہیں جن سے خواہ مخواہ کے تنازعے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایسے موضوعات پر جب وہ لکھتے ہیں تو ان کا رویہ ہمدردانہ نہیں ہوتا، اکثر ان کی ایسی تحریروں میں طنز و استہزا کا ایسا انداز ہوتا ہے جیسے کوئی کسی کی مصیبت و پریشانی سے لطف حاصل کرے۔ وہ اکثر سچی بات بھی ایسے اسلوب میں بیان کرتے ہیں جس سے ایک طرح کی چبھن محسوس ہوتی ہے۔ بہرحال اپنی اپنی طبیعت کا ایک تقاضا ہوتا ہے، بھلا اس میں ہم ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔

ایسی ہی ایک تحریر ان کی ۲۹ مئی ۸۳ء کے ٹائمز آف انڈیا کے "سنڈے ریویو" میں چھپی ہے جس کا عنوان ہے "عربوں کا عروج وزوال"۔ اس تحریر کو پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ گری لال جین کو اس سے کوئی خوشی نہیں ہے کہ ہمارے عرب بھائیوں کو تیل کی دولت مل گئی ہے، عرب جو ایشیائی اور افریقی ہیں اور جنھیں ابھی ماضی قریب میں مغربی اقوام، خاص طور پر

گئی ہے: خدا نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے اس لئے کوئی قوم اپنے آپ کو خدا کی برگزیدہ اور منتخب قوم نہیں کہہ سکتی جس کے ذریعہ اس دنیا میں مشیتِ الٰہی کی تکمیل ہوگی۔ سینٹ پال کے زمانے سے ہی عیسائی یہودیوں کو خدا کی "برگزیدہ قوم" تسلیم کرنے سے انکار کرتے رہے ہیں۔ خدا مقتدرِ اعلیٰ ہے اور وہ اپنی مشیت کی تکمیل کے لئے جو چاہے کر سکتا ہے، اس لئے اگر وہ کوریا کے کسی شخص کو اپنے کام کے لئے منتخب کرے تو یہ ناممکنات سے نہیں ہے۔ صدیوں سے تہذیب کا رُخ مغرب کی طرف رہا ہے۔ مشرق قریب کی قدیم شہنشاہتیں ختم ہوئیں تو ان کی جگہ رومی شہنشاہیت نے لے لی۔ پھر اس کے بعد یورپ کی طاقتیں ابھریں اور آخر میں اور آگے مغرب میں امریکہ کو مضبوط اور غالب حیثیت حاصل ہوئی، اس طرح اگر تہذیب و تمدن کے سفر کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے تو پھر امریکہ کے بعد اگلا مرکزی علاقہ مشرقی ایشیا ہے، یونیفکیشن چرچ کا خیال ہے کہ چونکہ جاپان اور چین کی مذہبی اساس ایسی نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی "نیا اسرائیل" بن سکے، اس لئے اگر خدا کی منشاء یہ ہے کہ نئی برگزیدہ قوم کی اساس مستحکم عیسائیت ہو، تو پھر مشرقی ایشیا میں صرف کوریا ہی وہ ملک ہے جو اس خصوصیت کا حامل ہے۔ اور یقیناً ریورنڈ مون ہی کوریا کی وہ شخصیت ہیں جو دکھی دنیا کو امن و سلامتی، نیکی اور سچائی اور خوشحالی و نجات کی راہ دکھا سکتے ہیں۔

اپریل سنہ ۱۹۸۳ء

لئے مفید اور نتیجہ خیز ہوں گے۔ ان ملکوں نے اپنی تیل کی دولت عیش وعشرت کے سامان فراہم کرنے میں نہیں اڑائی ہے، مصر میں بھی کسی قدر تیل نکلتا ہے اور وہ اسے اپنی معاشیات کو مضبوط ومستحکم کرنے میں صرف کرتا ہے۔ ٹیونس نے زندگی کی حقیقتوں کو سمجھا ہے اور باوجود رقبہ میں چھوٹا ہونے کے اس نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنے کردار سے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ اپنی آزادی کو قائم رکھ سکتا ہے اور اصلاح وترقی میں بڑے عرب ملکوں کی رہنمائی بھی کرسکتا ہے۔ فلسطینی عرب زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں اور انھوں نے اپنے داخلی نظریاتی جھگڑوں اور دنیا کی بڑی طاقتوں کے پیدا کئے ہوئے الجھاؤوں کے باوجود اپنی مثالی ہمت اور صلابت اور کردار کی مضبوطی کا جیسا اظہار کیا ہے وہ عربوں کی حالیہ تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ بلاشبہ بعض عرب ملک اپنی دولت کا بیجا اور غلط استعمال کرتے ہیں اور ان کے غیر اسلامی رویے، طرز زندگی، خدا کی ناشکری، تنگ نظری، کم ہمتی اور اخلاقی کمزوریوں پر ہمیں بھی افسوس ہوتا ہے۔ کاش، وہ اس موقع کو غنیمت سمجھتے اور تیل کی شکل میں اپنے بے پناہ وسائل کو ایسے تعمیری کاموں میں لگاتے جو عہد حاضر کی تاریخ کے بہاؤ پر اثر انداز ہوسکتے! کیا اچھا ہوتا کہ وہ خدا کے فضل وکرم کو جو ان پر غیر معمولی دولت کی صورت میں اترا ہے، اپنی اور بنی نوع انسان کی فلاح وبہبود کا سرچشمہ بنا لیتے اور دنیا کو یہ بتاتے کہ دولت کا صحیح مصرف کیا ہے اور اسلام اس سلسلے میں ان کی کیا رہنمائی کرتا ہے!

گری لال جین نے ایسے عربوں کی موجودہ خوشحالی اور عروج کو ہٹلر کے عروج سے تشبیہ دینے کی کوشش کی ہے اس لحاظ سے کہ ایک تو ہٹلر کی طاقت محض چند برسوں (۱۹۴۳-۱۹۳۴) کے لئے تھی اور دوسرے یہ کہ اس کے نازی فلسفے کی شکار بڑے پیمانے پر خود جرمن قوم تھی۔ وہ لکھتے ہیں: "۱۹۷۰ء کے دہے میں کالے سیال سونے کی افراط کے سبب عرب خود بڑے عذاب میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ اس نے یقیناً ان کے معاشرے میں انتشار پیدا کیا ہے... جو دولت اپنی محنت سے کمائی نہیں جاتی اس سے شریفانہ جذبات کمزور پڑ جاتے ہیں اور اخلاقی خرابیاں در آتی ہیں۔ تاریخ میں پہلے کبھی کسی قوم کو بغیر محنت کے اتنی بڑی دولت نہیں ملی، یہ ایک سیل بے پناہ ہے جو کبھی نہ کبھی ضرور رُکے گا لیکن اس کے نتائج باقی رہیں گے۔

برطانیہ نے جس کی محکوم خود ہماری قوم ایک عرصہ تک رہ چکی ہے، اچھی طرح لوٹا اور برباد کیا تھا، اور آج بھی یہ اقوام انھیں برباد کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تیل کی دولت عربوں کے لئے عذاب بن گئی ہے، لیکن عذاب کی اس منزل میں ان پر طنز کرنا اور ان کی ہنسی اڑانا، ہماری قومی اخلاقیات کے منافی ہے۔ گری لال جین نے یہ اسلوب نگارش اختیار کرکے درحقیقت اپنے ہی مزاج اور اپنی ہی طبیعت کی ترجمانی کی ہے، ہمارے قومی مزاج سے اس کا کوئی تعلق نہیں

جین صاحب لکھتے ہیں: "عرب 'صدی' تاریخ کی مختصر ترین صدی ثابت ہوئی ہے۔ یہ صدی ۱۹۷۳ء کے اواخر میں شروع ہوئی جب اوپیک (OPEC) نے یکایک تیل کی قیمت میں چار گنا اضافہ کیا اور اب (۱۹۸۳ء میں) یہ تنظیم خود ختم ہونے کے قریب آ لگی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ عرب ممالک جن کے پاس تیل کی دولت ہے، آج بھی مالی اعتبار سے بڑے متمول ہیں۔ صرف سعودی عرب اور کویت ہی کے پاس دو سو پچاس کھرب ڈالر کا محفوظ سرمایہ ہے۔ لیکن اب دنیا کو عربوں کا کوئی خوف نہیں۔ ان کے تیل کی مانگ کم ہو گئی ہے، اس کے مقابل نئے وسائل دریافت کر لیے گئے ہیں اور ان وسائل کو ترقی بھی دی گئی ہے، اس کے علاوہ صنعتی لحاظ سے ترقی یافتہ ملکوں نے یہ گر بھی سیکھ لیا ہے کہ تیل کی فی یونٹ پیداوار میں کمی ہو جانے پر بھی وہ اپنا کام چلا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر سعودی عرب کی تیل کی پیداوار ایک کروڑ بیرل یومیہ سے گر کر اب ۳۵ لاکھ سے ۴۰ لاکھ بیرل یومیہ تک رہ گئی ہے۔ گذشتہ سال تیل کی قیمتوں میں کمی ہوئی۔ اوپیک اپنے اراکین سے پیداواری کوٹے کو بھی تسلیم نہیں کرا سکی اور اب اس تنظیم کا وجود ہی خطرے میں ہے"

ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر جب عربوں کی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہیں تو وہ سعودی عرب اور خلیج کی امارات اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ہی پوری عرب دنیا تصور کرتے ہیں، حالانکہ الجزائر، تیونس، لیبیا، مصر، عراق اور فلسطینی بھی عرب ہیں۔ ان ممالک کے عرب باہم کئی خصوصیات میں ایک اور یکساں ہوتے ہوئے بھی، سعودی عرب اور خلیج کے اپنے عرب بھائیوں سے مختلف ہیں۔ الجزائر، لیبیا اور عراق میں تیل سے خاصی آمدنی ہوتی ہے اور ان عرب ملکوں نے اپنی اس دولت سے ٹھوس تعمیری کام کئے ہیں جو ان کی آنے والی نسلوں کے

حقیقت تھی کہ ایک عرب ملک کسی دوسرے عرب ملک کو بھی اپنا لیڈر نہیں مان سکتا تھا تیل کی دولت نے اس مسئلہ کو اور بھی پیچیدہ بنا دیا۔

"درحقیقت صحرا کے سراب کی طرح، یہ طاقت بھی محض ایک فریب تھی۔ دولت زمین کے نیچے سے ملی تھی اور طاقت اسی وقت موثر ہوتی ہے جب اس کی اساس مضبوطی کے ساتھ زمین پر ہو، عرب طاقت کی اساس ایسی نہ تھی۔ عربوں نے خود تیل کو دریافت نہیں کیا، نہ تو انھوں نے اسے نکالا اور نہ اسے بازار میں لائے۔ امریکہ اور یوروپ والوں نے ان کے لئے یہ سب کچھ کیا۔ ہاں، وہ تیل کی قیمت بڑھا سکتے تھے اور انھوں نے بڑے ڈرامائی انداز میں پہلے ۱۹۷۳ء میں اور پھر ۱۹۷۹ء میں یہ کر دکھایا۔ لیکن (اس سے عربوں کو یہ نقصان پہونچا کہ) مغرب پر اُن کا انحصار اور بڑھ گیا۔ انھیں اپنی دولت کے استعمال، یا یوں کہئے کہ غلط استعمال کے لئے اور جو کچھ اس کے بعد بچ جائے اسے محفوظ رکھنے کے لئے مغرب کے سہارے کی ضرورت تھی کیونکہ وہ خود اپنے سرمایے کی حفاظت کا انتظام نہیں کر سکتے تھے۔ دولت کی بہتات نے عربوں میں عدم تحفظ کا احساس اور جدید معاشی ڈھانچے کی تشکیل کی آرزو پیدا کی، انھیں ان دونوں مقاصد کے لئے مغرب اور جاپان کی مدد کی ضرورت تھی۔"

جدید معاشی ڈھانچے کو کھڑا کرنے اور اسے کامیابی کے ساتھ قائم رکھنے اور ترقی دینے میں محنت، صلاحیت، کارکردگی اور ایمانداری کی ضرورت ہوتی ہے، اور کردار کی یہ خوبیاں دولت سے پیدا نہیں کی جاسکتیں، متمول عرب ملکوں میں ہنرمندی اور جدید تکنیکی مہارت بھی نہ تھی، خاص طور پر سعودی عرب اور خلیج کی ریاستیں ان خصوصیات سے محروم رہی ہیں، جدید تعلیم کی روایت بھی ان کے یہاں بڑی کمزور رہی ہے، اس لئے منصوبہ بند معاشیات اور اس کے مضمرات کا بوجھ اٹھانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ اور شاید ان عرب ملکوں نے اس مسئلہ پر کبھی سنجیدگی سے غور بھی نہیں کیا۔ اسرائیل جو ان کے بیچوں بیچ قائم ہوا اور جو ان کی شدید مخالفت اور کئی جنگوں کے باوجود نہ صرف باقی ہے بلکہ اپنے تمام عرب ہمسایہ ملکوں سے بیک وقت نبٹنے کا حوصلہ رکھتا ہے، محض امریکہ اور مغربی ممالک کی مالی امداد اور ان کے اسلحوں کے سہارے ہی نہیں زندہ ہے، بلکہ خود اس کے شہریوں میں بعض خصوصیات ایسی ہیں جن کے سبب مغرب کی ہر

"اس غیر معمولی دولت نے عربوں کو طاقت اور جاہ و حشم کے کئی فریب میں مبتلا کر دیا۔ اگر عربوں میں دولت کا نشہ نہ پیدا ہوتا تو وہ مافوق البشر ہوتے۔ ہم انھیں خطاوار نہیں ٹھہرا سکتے اگر ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ ساری دنیا ان کے قدموں میں ہے اور یقیناً دنیا ان کے قدموں پر جھک گئی۔ عرب ملکوں اور ایران سے مغربی ملکوں اور جاپان میں تیل کی برآمد کا دو تہائی حصہ پہونچتا تھا جس پر ان کی صنعتی معاشیات کا انحصار تھا۔ دنیا کے بڑے بڑے بنک کارصنعت کار اور تجارتی کمپنیاں ان کے دروازوں کو محفوظ سرمائے اور ٹھیکے کے لئے کھٹکھٹاتی تھیں، لندن نیویارک اور پیرس کے بازاروں میں اُن کا پر جوش خیر مقدم کیا جاتا تھا، ان بازاروں میں سائن بورڈ عربی میں بھی آویزاں کئے جانے لگے۔ عرب بڑے اعتماد کے ساتھ دنیا کے کسی مقام پر جا سکتے تھے، یہاں تک کہ واشنگٹن میں وہائٹ ہاؤس اور لندن میں نمبر ۱۰ ڈاوننگ اسٹریٹ کے دروازے بھی ان کے لئے کھلے ہوئے تھے اور انھیں یقین تھا کہ جہاں بھی وہ جائیں گے گرمجوشی سے ان کو اہلاً وسہلاً کہا جائے گا۔ فلم بنانے والوں نے خاص عربوں کے لئے فلمیں بنائیں، صرف بمبئی اور دہلی ہی میں نہیں بلکہ لندن، نیویارک اور ٹوکیو میں بھی بڑے بڑے ڈاکٹروں، انجینیروں اور تعمیر کاروں نے اپنے عرب گاہکوں کو ترجیح دی۔

"غیر کمیونسٹ دنیا میں، ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ اب عربوں ہی کا حکم چلے گا اور ایک مرحلے پر تو یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ عظیم ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی، اسرائیل سے اپنے تمام معاہدوں کے باوجود، عربوں کے دباؤ کے آگے جھک جائے گی اور اسرائیل کو مقبوضہ عرب علاقوں سے ہٹنے پر مجبور کر دے گی۔ ایشیا اور افریقہ کے اوسط درجے کے لوگ ہر عرب کو برلا اور ٹاٹا سمجھتے تھے۔ زیادہ تر عرب ایسے انداز میں گفتگو کرتے تھے اور ان کا رویہ اس طرح کا ہوتا تھا جیسے ان کے پھیلاؤ اور ان کی طرز زندگی کے غلبے کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے، مثلاً، انھوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ صرف وہی اسلام کے محافظ ہیں اور ان ہی کے ذریعہ اسلام کی اشاعت ہوگی .... (تقسیم ہند کے بعد) کچھ عرصہ تک پاکستانی بھی اسی فریب میں مبتلا رہے ... کہ وہ مسلم دنیا کے قائد ہو سکتے ہیں لیکن جلد ہی اس فریب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ عرب کسی غیر عرب کی قیادت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ایک

"اسلحوں کی خریداری سے زیادہ عربوں کے نام نہاد ترقیاتی منصوبوں پر دولت بے نتیجہ اور فضول صرف کی گئی ہے۔ مغرب نے جس طرح بھاری قیمت کے ایسے اسلحے ان کے ہاتھ فروخت کئے جو ان کے لئے بیکار ہیں، اسی طرح اس نے ترقیاتی منصوبے بھی فروخت کئے ہیں جنھوں نے کھربوں ڈالر نگل لیے ہیں اور نتیجہ زیادہ تر یہ نکلا ہے کہ عرب دنیا کا سماجی انتشار اور بڑھ گیا ہے۔ جن عرب ملکوں میں تیل کی دولت ہے ان میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جہاں ہنرمند افراد اور ماہرین کی بہت کمی ہے۔ اس لئے انھیں بہت بڑے پیمانے پر ایسے لوگوں کو درآمد کرنا پڑا ہے۔ لیکن کس کام کے لئے؟ محلوں کی تعمیر کے لئے۔ لیکن یہ محل پھر بھی بہتر ہیں ان نام کی تنصیبات سے جو ملک کے داخلی بازار کی ضرورتوں کو کبھی پورا نہیں کر سکتیں کیونکہ وہ بہت چھوٹی ہیں اور چونکہ ان کی پیداوار پر لاگت زیادہ آتی ہے اس لئے باہر سے آنے والی چیزوں کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ ریگستانی علاقوں میں جہاں آبادیاں دور دور ہوں اور جو ابھی خانہ بدوشی کی زندگی کی منزل سے پوری طرح آگے نہ بڑھے ہوں، شائد جدید معاشیات کی تنظیم نہیں ہو سکتی اور اگر ہو بھی جائے تو اُسے قائم نہیں رکھا جا سکتا۔

"دولت نے عربوں میں یہ خواہش پیدا کر دی ہے کہ وہ دنیا میں بے روک تیز رفتاری کے ساتھ گھومیں پھریں۔ وہ اپنی خواہشات کو کیوں پابند کریں جب انھیں پورا کرنے کے لئے ان کے پاس وسائل ہیں۔ اس لئے انھوں نے بہترین کاریں، وڈیو سیٹ اور کمپیوٹر اور اسی طرح کی دوسری چیزیں جو مغربی ملکوں اور جاپان میں بنتی ہیں خریدی ہیں۔ انھوں نے اپنے محلوں کے لئے تیار شدہ باغات تک درآمد کئے ہیں۔ ان کے یہاں سڑکیں کافی چوڑی ہیں۔ ان کے ہوائی اڈے بہت بڑے ہیں ان کی بندرگاہیں بہت وسیع ہیں، اس سے مطلب نہیں کہ انھیں اتنی چوڑی سڑکوں اور اتنے بڑے ہوائی اڈوں اور بندرگاہوں کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ انھوں نے نہایت آرام دہ ہوائی جہاز بھی خریدے ہیں... مغربی ملکوں اور جاپان نے ان سب باتوں کو معمول کی تجارت کے طور پر کیا ہے۔ انھیں تو اپنا وہ سرمایہ واپس لینا تھا جسے انھوں نے تیل پر خرچ کیا تھا، ورنہ وہ دیوالیے ہو جاتے۔"

ان عرب ملکوں میں ایک عجیب و غریب صورت حال یہ پیدا ہو گئی ہے کہ بہت سے "شیوخ" کاروبار میں تھوڑا بہت سرمایہ لگانے لگے ہیں، لیکن چونکہ وہ جدید طرز کی تجارت کے گُر سے واقف نہیں ہیں اور اپنی عیش پسندی اور آرام کوشی کے سبب ان سے واقف ہونا بھی نہیں چاہتے، اس لئے ان کے نام سے غیر ملکی سرمایہ دار تجارت کرتے ہیں کیونکہ انھیں قانون کی زد سے بچنے کے لئے تجارت میں مقامی

طرح کی امداد سے انھوں نے فائدہ اٹھایا اور اپنے وجود کی معاشی، معاشرتی، سیاسی اور فوجی اساس کو مضبوط کیا۔

یہ وہ حقیقتیں ہیں جنھیں عربوں کے ہمدرد اور دوست بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ گری لال جین نے اپنے مضمون میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے اور عربوں کو اپنے بے رحمانہ طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "(عرب اپنی دولت سے) ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملکوں کی مدد کر سکتے تھے اور ان کے اشتراک سے خود بھی فائدہ اٹھا سکتے تھے . . بلکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں سے بھی انھوں نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی، البتہ فوجی سامان کی خریداری میں وہ اس کی مدد کرنے کے لئے ہمیشہ آمادہ رہے . . . خود انھوں نے ایسے فوجی اسلحوں کی خریداری پر اربوں ڈالر صرف کئے جنھیں وہ استعمال نہیں کر سکتے، غالباً وہ ان اسلحوں کو استعمال کرنے کی خواہش بھی نہیں کریں گے کیونکہ اس میں خود ان کے لئے بڑے خطرات ہیں جن کا سامنا کرنے کی نہ تو ان میں طاقت ہے اور نہ اہلیت۔ بعض عربوں نے تو اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ انھوں نے یہ اسلحے اس لئے نہیں خریدے ہیں کہ انھیں ان کی ضرورت تھی، بلکہ اس لئے کہ سیاسی وجوہ کی بنا پر وہ ان ملکوں کی حکومتوں کو خوش کرنا اور راضی رکھنا چاہتے تھے جہاں سے یہ اسلحے خریدے گئے ہیں۔

"پچھلے سال گرمیوں میں اس قسم کی فوجی اسلحوں کی خریداریوں کا بھانڈا اس وقت پھوٹا جب اسرائیل نے لبنان پر حملہ کیا، فلسطینیوں کی بستیوں پر زمین اور آسمان سے گولے برسائے، وہاں سے فلسطینیوں کے اخراج کا مطالبہ کیا اور بیروت اور فلسطینی پناہ گزینوں کے کیمپوں میں ان کا قتل عام کیا۔ اس وقت ایک عرب ملک بھی ان کی مدد کو نہیں پہونچا، عرفات اور ان کے ساتھیوں نے اپنی مصیبت کے ان ایام میں ان کی بڑی لعنت ملامت کی، لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ فلسطینیوں کے کاز کی حمایت میں جذباتی تقریروں کے باوجود، کوئی عرب ملک اسرائیل سے لڑنے کے لئے آمادہ نہ ہوا اور اس کا جو نتیجہ ہوا وہ سب پر ظاہر ہے۔ اسرائیل اپنے مقصد میں کامیاب ہے اور فلسطینی مجاہدین دربدر پھر رہے ہیں۔ اب جنوبی لبنان کی سمت سے اسرائیل کو خطرہ نہیں ہے۔

# سیکولرزم اور مذہب

اس مضمون میں ہم سیکولرزم اور مذہب کے موضوع پر کوئی علمی و نظری بحث نہیں کریں گے۔ ہم آج یہ دیکھیں گے کہ اس طرز حیات کے سلسلے میں مذہبی معاشروں کا کیا ردعمل رہا ہے۔ کوئی ایک سو برس سے تقریباً سبھی مذاہب کو، لیکن خاص طور پر ان مذاہب کو جن کا سرچشمہ ایک آسمانی کتاب ہے، سیکولرزم کا سخت سامنا ہے۔ مختلف سمتوں سے اس نے انھیں متاثر کرنے کی کوشش کی ہے اور آج بھی اس کی یہ کوشش جاری ہے۔ سائنس کی ترقی کی وجہ سے اُس نظریۂ کائنات کو بھی فروغ حاصل ہوا ہے جو اپنی ظاہری صورت میں تورات، انجیل اور قرآن جیسی مقدس کتابوں سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ نظریہ فرد کو ایک طرح کی ایسی اخلاقی آزادی دیتا ہے جو مقدس کتابوں کے دینی احکامات کی پابندی سے میل نہیں کھاتا اور جس میں عہد جدید کے فرد کے لیے بڑی کشش ہے۔ اشتراکیت کے اثر سے بھی مذہب کے بارے میں بعض بدگمانیاں پیدا ہو گئی ہیں، اس کی طرف سے مذہب پر سب سے بڑا الزام یہ رہا ہے کہ اس سے طبقاتی تفریق مستحکم ہوتی ہے اور طبقاتی کشمکش سے پیدا ہونے والے مصائب و مشکلات میں یہ انسان کو صبر و برداشت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان باتوں کا جواب جو جدید یا سیکولر طرز فکر کی خصوصیات ہیں مختلف مذہبی معاشروں کی طرف سے الگ الگ انداز میں دیا گیا ہے۔ بعض معاشروں نے تو جدیدیت کو یکقلم رد کر دیا ہے، لیکن زیادہ تر ایسے ہیں جنھوں نے بظاہر وسیع النظری

لوگوں کی مشارکت کی ضرورت ہے۔ اس طرح امیروں کا ایک ایسا بیکار، کاہل اور ناکارہ طبقہ پیدا ہوگیا ہے جسے یکے بعد دیگرے ہیجان انگیز تماشوں کی تلاش رہتی ہے۔ یہ غیر ملکی تاجر زیادہ تر امریکی اور یورپین ہیں۔ یہ صورت حال جو مغرب کی چالاکیوں کے سبب روز بروز پیچیدہ تر ہوتی جارہی ہے، مسلمان عربوں کے خلاف مغرب کے عیسائیوں اور ان کے پردہ میں بعض یہودی سرمایہ داروں کی ایک ایسی "جنگ" ہے جسے ہم ایک دوسرے اور نئے روپ میں "صلیبی جنگوں" کی توسیع کہہ سکتے ہیں۔ یہ جنگ اس لئے زیادہ خطرناک ہے کہ اس سے مسلمان عربوں کی مذہبی اور تہذیبی اساس کمزور ہوتی جارہی ہے، ان میں اسلامی حمیت وغیرت کا شعور ماند پڑتا جارہا ہے اور مغربی تہذیب کی نقالی انھیں اسلام کی اخلاقی تعلیمات سے دور لے جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عربوں کے اس نئے طبقے کے خلاف عرب عوام میں غم و غصے کے آثار پائے جاتے ہیں اور ان میں ایسے گروپ ملتے ہیں جو اپنی تلخیوں کا کبھی کبھی برملا اظہار بھی کردیتے ہیں، عرب حکمراں طبقے کو انھیں قابو میں رکھنے کے لئے ان کی سرگرمیوں پر نظر رکھنی پڑتی ہے، اور اس کے لئے بھی انھیں امریکہ کی طرف دیکھنا پڑا ہے۔ امریکہ کی مدد سے انھوں نے ایک وسیع، منظم اور مضبوط نظم و نسق خفیہ سراغ رسانی کا قائم کر رکھا ہے جس سے ہمہ وقت خوف و ہراس کی فضا طاری رہتی ہے اور آدمی آزادی سے نہ تو اپنے گھر میں رہ سکتا ہے اور نہ باہر گھوم پھر سکتا ہے۔

بہرحال، گری لال جین کے تجزیئے میں خواہ کتنا ہی مبالغہ کیوں نہ ہو، عرب دنیا کے جو حالات ہیں وہ افسوسناک ہیں، خاص طور پر ان عرب ملکوں میں جو تیل کی دولت سے مالامال ہیں، بعض تلخ حقیقتیں ایسی ہیں کہ ہم گری لال جین کی ساری باتوں کی تردید نہیں کرسکتے۔ ہاں، یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ گذشتہ دس سال کی مدت کو عربوں کے عروج وزوال کی صدی قرار دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ کل کون یہ جانتا تھا کہ صحرائے عرب کے مشرقی کنارے اور خلیج کے علاقے میں اتنے وافر بہتے ہوئے سونے کے چشمے ہیں جو نہ صرف عرب دنیا بلکہ پوری دنیا کے لئے وسیع اور پیچ در پیچ امکانات سے معمور ہیں، اور آج کون یہ کہہ سکتا ہے کہ مستقبل کس کا ہے اور کیوں ہے؟ زمین و آسمان کے تمام خزانوں کی کنجیاں خدا کے پاس ہیں، وہی جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ ہمیں کسی فرد، کسی جماعت، کسی قوم کے عروج وزوال کا فیصلہ اتنی آسانی سے نہیں کردینا چاہیے۔ (جولائی ۱۹۸۳ء)

پورے طور پر اپنے آپ کو الگ نہیں رکھ سکی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی صحیح ہے کہ سیکولرزم کا موثر اور پرزور چیلنج ہنوز باقی ہے اور عیسائیت موقع موقع سے مختلف طریقے اختیار کر کے اپنا دفاع کر رہی ہے۔ اس صورت حال نے ایک عرصے سے عیسائی معاشروں میں ذہنی داخلاقی سطح پر غضب کا انتشار پیدا کر رکھا ہے۔

اسلامی دنیا میں سیکولر تصورات ایک طاقتور اور خوش حال یورپ کے پھیلتے ہوئے سیاسی و معاشی اثرات کے ساتھ داخل ہوتے۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی پیدا ہوئی جو اس خیال میں تھی کہ جدید طرز حیات کو اپنا کر (سیکولر تصورات اس طرز حیات کا ایک موثر جزو تھے) اسلامی دنیا جس پر یورپ کی بڑی طاقتیں غالب آگئی ہیں، اپنا دفاع کر سکے گی، اور انھیں کی طرح طاقتور اور خوش حال ہو جائے گی۔ ایک روایتی سماج میں جہاں لوگوں کو یہ بتایا گیا ہو کہ رعایا کا یہ مذہبی فرض ہے کہ حکمراں کی اطاعت کی جائے، خواہ حکمراں ظالم، فاسق فاجر یا پاگل ہی کیوں نہ ہو، سیکولر تصورات کی مقبولیت سے (خواہ یہ مقبولیت کتنے ہی محدود حلقے ہی میں کیوں نہ ہو) سخت کشاکش کا پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ سیکولرزم چونکہ ایک نامذہبی تصور ہے اور فرد کو ضمیر و فیصلے کی آزادی دیتا ہے (یہاں اس سے بحث نہیں کہ ضمیر و فیصلے کی یہ آزادی بذات خود کیا ہے)، اس لیے اُسے روایتی سماج کا یا اصول قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ ایک روایتی مُسلم سماج میں جہاں حکمراں مُسلمان تھا، غیر مسلم بھی رہتے تھے اور انھیں مسلمانوں کے ساتھ سیاسی سطح پر مساویانہ حیثیت نہیں حاصل ہو سکتی تھی، سیکولرزم زندگی کے ہر شعبہ میں مساوات انسانی کا دعویدار تھا، اس لئے غیر مسلموں نے اس کا پُرجوش استقبال کیا اور مساوی حقوق کا مطالبہ کرنے لگے۔ اُن کے اس موقف کو یورپ کی استعماری طاقتوں نے اپنے سیاسی مفاد کے لئے استعمال کیا۔ بین الاقوامی سطح پر بھی مُسلم ریاستوں کو دشواری پیش آئی، روایتی معاشرہ دنیا کو دارالاسلام اور دارالحرب میں منقسم دیکھتا تھا، لیکن اب جدید بین الاقوامی قانون کی رو سے دنیا کی ساری آزاد مملکتیں مساوی حیثیت کی حامل تھیں۔

اسلامی دنیا میں سیکولرزم کے حامی ترقی اور خوش حالی کا جو خواب دیکھتے تھے، وہ

کا اظہار کیا ہے اور اپنے آپ کو وقت کے مطابق ڈھالنے پر آمادگی ظاہر کی ہے۔
عیسائی دنیا میں تو اکثر یہ بات کہی جاتی رہی ہے کہ لبرل دانشوروں کی آئیڈیولوجی سے وفاداری
کا ثبوت تو مذہبی جماعتوں کو بھی دینا چاہیئے اور انگلستان کی کلیسا (چرچ آف انگلینڈ)
میں کئی دہوں سے یہ رجحان غالب ہے۔ لیکن یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ عیسائیت کو
سیاست سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیئے اور یہ کہ عیسائیت سماجی خدمت کا
مذہب نہیں ہے، درحقیقت لبرل دانشوروں کی آئیڈیولوجی ایک طرح کی سیاست
ہی ہے جیسے چرچ آف انگلینڈ نے اپنا رکھی ہے۔ "روح عصر" سے متعلق یہ مبہم اور
کبھی کبھی متضاد رویہ ہمیں کلیساؤں کی عالمی تنظیم (ورلڈ کونسل آف چرچز) اور رومی
کیتھولک کلیسا کے موجودہ موقف میں بھی ملتا ہے۔ مذہب بہرحال، دنیا میں
سیاسی و معاشی کش مکش سے رونما ہونے والے واقعات سے جن کا بالآخر کسی نہ کسی
شکل میں مذہبی زندگی پر بھی اثر پڑتا ہے، اپنے آپ کو بالکل الگ تھلگ نہیں رکھ
سکتا۔ عیسائی مذہب میں خدا اور سیزر (یعنی دنیوی اعتبار سے حکمراں یا حکمراں
جماعت اور اس کے ذیلی ادارے) دو الگ الگ خانے بنا دیئے گئے ہیں،
سولہویں صدی کے بعد، عیسائی دنیا آتش و خون کے ایک خوفناک سیلاب سے
گذر کر مجموعی طور پر اس بات پر عملاً متفق ہو گئی لیکن فنڈامنٹلزم کے رجحانات وہاں بھی
کبھی کبھی ابھرتے رہے اور JEVOHA'S WITNESS کے طرز کی مذہبی جماعتیں
قائم ہوتی رہیں۔ مغرب میں آج بھی ایسے بشپ اور پادری خاصی تعداد میں موجود ہیں جو "ایمان
والوں" کے دل میں خدا کو زندہ رکھنے کی سعی میں لگے ہوئے ہیں اور اس کا یقین رکھتے ہیں کہ
صرف پادری ہی یہ کام کر سکتے ہیں۔ ایک لبریشن دینیات کا تصور، عیسائی مغرب میں خواہ وہ
اپنے آپ کو کتنا ہی لبرل کہے، مقبول ہو رہا ہے، تیسری دنیا کے عیسائی، بنیادی طور پر جن
کا رشتہ و پیوند عیسائی مغرب سے ہے، استعمار نو، تاجر اقوام کی مشترک کمپنیوں کے روز افزوں
سیاسی و معاشی غلبے اور گوریلا جنگوں سے متعلق آزادانہ گفتگو کرتے اور اخباروں اور ٹیلی ویژن
کے صحافیوں کو بیانات دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ سیاست و معیشت مذہب سے

کہ خالص اسلامی ریاست نہ قائم کی جا سکے اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح کی زندگی گزارنا ممکن نہ ہو۔ لیکن ترکوں کا تجربہ ہمارے سامنے ہے اور خود اُن ملکوں کا حال بھی ہمیں معلوم ہے جو آج "فنڈامنٹلزم" کے علمبردار ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے کی طرح آج بھی مغربی سائنس، مغربی ٹیکنولوجی اور اس کی مدد سے بنائی جانے والی چیزوں کے توسط سے سیکولرائزیشن کا عمل بھی ان ملکوں میں در آیا ہے اور اس طرح در آیا ہے کہ "سرحدوں" کی حفاظت کرنے والوں کو اس کی خبر نہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ سیکولرزم کے حامیوں کی جماعت نہ تو اسلام کی حفاظت کر سکی اور نہ اسے سیاسی طور پر مضبوط اور طاقتور ہی بنا سکی۔ سوال یہ ہے کہ آج تحفظ اور طاقت کی ضمانت کون لے سکتا ہے جب مسلم ملکوں میں وہ اسلحے تیار نہیں ہوتے جن پر تحفظ اور طاقت دونوں کا دارومدار ہے۔ یہ ایک ایسی صورت حال ہے جس کا مداوا اسلامی تحریکوں کے پاس بھی نہیں ہے۔

یہودیت پر بھی سیکولرزم اور سیکولرائزیشن کا گہرا اثر پڑا ہے اور یہودیوں کے معاشرے بھی ایک تناؤ کی حالت میں رہے ہیں اور یہ صورت حال آج بھی موجود ہے۔ یہودیوں کا اپنے بارے میں تو ایک روایتی نظریہ تھا، یہ نظریہ آج بھی موجود ہے۔ سیکولرائزیشن نے ان کے سامنے دو اور نظریے پیش کیے جو ان کے روایتی نظریے سے مختلف تھے، لیکن یہ دونوں نظریے بھی جدید دنیا میں اُن کے لئے سکون و اطمینان کی ضمانت نہ بن سکے۔

یہودیوں کا روایتی نظریہ صاف اور سادہ ہے۔ بنی اسرائیل اور خدا کے مابین ایک میثاق تھا جو خدا نے ان سے لیا تھا۔ وہ اجتماعی طور پر اس میثاق کے شرائط پر عمل کرنے کے ذمہ دار ہیں لیکن انفرادی طور پر بھی ہر یہودی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ یہ دیکھتا رہے کہ میثاق پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ میثاق کو توڑنا خدا کی نافرمانی ہے، ایک ایسا گناہ جس کی سزا حدود اللہ کا پاس نہ کرنے والے کو بھی ملتی ہے اور پوری جماعت کو بھی۔ بنی اسرائیل نے کئی بار اس میثاق کی خلاف ورزی کی اور ہر بار نتیجہ کے طور پر انھیں جلاوطنی اور منتشر ہو کر در در کی خاک چھاننے کی سزا بھگتنی پڑی، لیکن اللہ تعالیٰ اگر انصاف کرنے والا ہے تو وہ رحیم و

شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا کیونکہ سیکولرزم کی علمبردار مغربی طاقتیں خود اپنے ذہنی و اخلاقی تضادات کا شکار تھیں، ان مغربی طاقتوں کے تحت الشعور میں جس کی تشکیل میں عیسائیت کا نمایاں حصہ تھا، خود یہ بات جاگزیں تھی کہ ایک تو عیسائی دنیا ہے اور ایک وہ دنیا جہاں "کفار" بستے ہیں اور خدا کی بادشاہی "کافروں" کی دنیا میں بھی قائم کرنی ہے۔ تہذیبی سطح پر اس تصور نے "سفید فام اقوام کی ذمہ داری" کے نظریے کو جنم دیا۔ اب کیا تھا حیلہ بازیوں، مکاریوں، سیاسی داؤں پیچ اور بوقت ضرورت فوج کشیوں کی راہ ہموار تھی اور استعمار کی بنیاد پڑنے لگی۔ سیکولرزم کے حامی، مسلم معاشروں میں یورپ کی استعماری طاقتوں کے ہراول دستے قرار پائے اور اُن پر اسلام سے غداری کا الزام لگایا گیا۔ یہ اُس وقت بھی تھا جب مغربی تہذیب اپنے نقطہ عروج پر تھی اور آج بھی، بلکہ آج تو اسلامی تحریکات کا جنھیں غلطی سے "فنڈامنٹلزم" کا بڑھتا ہوا رجحان کہا جاتا ہے، ایک سیلاب ہے جو بظاہر کسی کے روکے رکنے والا نہیں دکھائی پڑتا۔

لیکن اسلامی "فنڈامنٹلزم" یعنی اسلامیت کی تحریکیں بھی خود اپنے ہی تضادات میں مبتلا ہیں، سیکولر بن جانے کا ایک نادیدہ عمل ہے جو ہر جگہ جاری ہے، یہ تحریکیں اس عمل کی نکیر و تردید تو کرتی ہیں لیکن ان کے مبلغین مغربی سائنس کے محتاج ہیں اور ان تمام چیزوں کے بھی جنھیں اس سائنس کے اطلاقی مظہر یعنی ٹیکنولوجی نے جنم دیا ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ترکی میں یہ بحث بڑے زوروں میں چلی تھی کہ ترکوں کو مغرب سے کیا لینا ہے اور کیا نہیں لینا ہے۔ ان میں ایک گروہ تھا جو یہ کہتا تھا کہ اگر ہم گلاب کے پھول لیں گے تو کانٹوں سے دامن نہیں بچا سکتے۔ یعنی اگر ہمیں مغرب کی تکنیکی مہارت اور وہاں کی بنی ہوئی چیزیں لینی ہیں تو ایسے بہت سے تصورات بھی اپنانے ہوں گے جن کے سبب مغربیوں میں یہ تکنیکی مہارت پیدا ہوئی ہے، ایک اور گروہ یہ سمجھتا تھا کہ ہم پھول چن لیں گے اور کانٹے چھوڑ دیں گے۔ آج کی اسلامی تحریکوں والے بھی کچھ اسی طرح کی بات کرتے ہیں، یعنی موٹر کار، ٹیلیفون، ٹی وی، الیکٹرونکس کے "کھلونے"، کمپیوٹر، اور واشنگ مشین وغیرہ ضرورت کی چیزیں ہیں، ان کو باہر سے لینے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں

ڈال دیا۔ اب وہ کہیں کے نہ رہے، بیک وقت جدید نظریہ اور روایتی نظریہ دونوں سے وفاداری کا اظہار ہونے لگا۔ گویا یہودیوں کی بھاری اکثریت اس عہد جدید میں منافقت میں مبتلا ہو گئی۔

جس طرح یوروپ کی روشن خیالی کے دور میں یہودیوں میں جدید نظریہ مقبول ہوا تھا، اسی طرح نظریۂ قومیت سے جو جدید مغرب کا سب سے زیادہ موثر اور طاقتور نظریہ ہے، متاثر ہو کر یہودیوں کی ایک جماعت نے تحریک صہیونیت کی بنیاد رکھی صہیونیت کے علمبردار یہ کہتے تھے کہ یہودیوں کی بقا اور ان کے مذہبی و تہذیبی تشخص کا تحفظ اسی صورت میں ممکن ہے جب ان کا من حیث القوم ایک قومی وطن ہو۔ اسرائیل کا قیام اسی خواب کی تعبیر ہے۔

لیکن تحریک صہیونیت کے بانیوں کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں ہوگی کہ ارض فلسطین میں اسرائیل کا قیام خود یہودیوں کے لئے وبال جان ثابت ہوگا۔ مغرب کے جس نظریۂ قومیت سے انھوں نے فیضان حاصل کیا تھا اس کی رو سے مذہب، وطنیت کی بنیاد نہیں ہے۔ اس کی بنیاد سیکولرزم ہے۔ اگر بے وطنی یہودیوں کے لئے ایک مصیبت تھی، تو اسرائیل کے قیام سے دنیا کے تمام یہودیوں کی وہ مصیبت دور نہیں ہوئی، پھر جن حالات میں اس کا قیام عمل میں آیا اور آج اس کے وجود کو جو خطرات لاحق ہیں ان سے ان کی مشکلات میں اضافہ ہی ہوا ہے۔ اس چھوٹے سے ملک میں دنیا کے تمام یہودی نہیں سما سکتے جو پورے عالم اسلام سے یہ ایک مستقل جنگ کی حالت میں ہے۔ ایسی صورت میں "غریب الوطنی" صہیونیت کے اپنے مسلک کے برخلاف، یہودیوں کی ایک بڑی آبادی کا مقدر ہے۔ پہلے بھی وہ دنیا کے مختلف حصوں میں منتشر تھے اور آج بھی اپنے "وطن"، یعنی اسرائیل کی بھلائی اور بقا کے لئے انھیں منتشر رہنا ہے۔ یہودیوں کی حالیہ تاریخ میں سب سے زیادہ اُلٹی بات یہ ہوئی ہے کہ ان کی ایک جماعت یہ کہنے لگی ہے کہ عام یہودیوں اور اسرائیلیوں میں بنیادی فرق ہے۔ جو یہودی فلسطین میں آکر بسے وہ اس لئے وہاں بسے کہ وہ یہودی تھے اور یہودی ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اسرائیل

کریم بھی ہے، اس لئے وقت آئے گا کہ وہ بنی اسرائیل کی خطائیں معاف کر دے گا، غریب الوطنی اور دَر دَر بھٹکنے کی لعنت ختم ہوگی اور یہودیوں کا نجات دہندہ ( MESSIAH ) یروشلم میں تخت نشین ہوگا۔

یہودیوں کے اپنے متعلق روایتی نظریے میں ایک بات اور تھی، اور وہ یہ تھی کہ بادشاہت کے مقابلہ میں نبوت افضل تھی، اس لئے دنیوی اقتدار کے بجائے کمزوری اور ناطاقتی یہود کی تاریخ کا ایک اہم حصہ رہی ہے اور اس کے روایتی نظریے میں ناطاقتی کوئی ایسی فکرمندی اور پریشانی کی بات نہیں ہے لیکن اس کے برخلاف جو جدید نظریہ ان میں مقبول ہوا اُس نے روایتی نظریے کو بہت کمزور کر دیا۔ جدید نظریے کے مطابق یہودی خدا کی منتخب کی ہوئی کوئی برگزیدہ قوم نہ تھی اور نہ ہی تاریخ میں خالق کائنات کے نمائندہ کی حیثیت سے انھیں کوئی امتیاز حاصل تھا، بلکہ اب عالم انسانی میں وہ انسانوں کی مختلف جماعتوں میں سے محض ایک جماعت تھی جو دوسروں کی طرح تاریخ کے مختلف ادوار سے گذری تھی۔ اب وہ سب کے برابر اور عالمی انسانی برادری کا ایک حصہ تھے، یعنی وہ اپنے گھر میں تو یہودی تھے لیکن باہر عام انسانوں کی طرح انسان۔

جس چیز کو یورپ کی روشن خیالی کہا جاتا ہے وہ جب یورپ کی مختلف یہودی بستیوں میں پھیلی تو یہ جدید نظریہ بھی اُن میں بہت زیادہ مقبول ہوا۔ لیکن جب یورپ کی ایک ایسی قوم نے نازیت (نازی ازم) کی بھرپور تائید کی جو جدید تہذیب کے قائدین میں سمجھی جاتی تھی، اور پھر اس کے نتیجہ میں جو تباہ کاریاں دیکھنے میں آئیں، تو روشن خیالی، ترقی اور تہذیب سب کا بھرم کھل گیا، اور یہودیوں نے روایتی نظریے کے بالمقابل اپنے بارے میں جو جدید نظریہ اپنایا تھا وہ بھی محض ایک خواب پریشاں ثابت ہوا۔ جس روایتی نظریے کو رجعت پسندانہ ظلمت پسندی کہا جانے لگا تھا، اسی میں اب یہودیوں کو ایک بار پھر اپنے درد کا درماں نظر آیا اور اسی سے پھر توقعات وابستہ کی جانے لگیں، کیونکہ روشن خیال یہودیت جس صورت حال کی وضاحت نہیں کر سکتی تھی، روایتی یہودیت کے روحانی وسائل اُس سے بخوبی نبرد آزما ہو سکتے تھے۔ لیکن اس صورت حال نے یہودیوں کو عجیب مخمصے میں

# شریعت اور وقت کے تقاضے

اسلام اور عصر جدید کے اس شمارے میں محجوب الارث یعنی یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلہ پر تین مضامین شائع ہو رہے ہیں تینوں مضامین قدیم طرز پر تعلیم پائے ہوئے اصحاب قلم سے ہیں، ان میں سے ایک مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم کے قلم سے ہے جو معارف (اعظم گڑھ) میں ۱۹۱۸ء میں (جلد ۳، نمبر ۱-۲) مسائل و فتاوی کے عنوان کے تحت اس نوٹ کے ساتھ شائع ہوا تھا: "اس مضمون کی تنقید اور اصل مضمون کی تحقیق پر علمائے فرائض میں سے کوئی بزرگ سنجیدگی اور دلائل کے ساتھ لکھیں گے تو ہم اس کو شکریہ کے ساتھ شائع کریں گے"۔ معارف میں تو اس سلسلے میں کوئی دوسرا مضمون نہیں چھپا اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اُس زمانے میں کسی دوسرے رسالے میں بھی نہیں چھپا۔ مولانا جیراجپوری طبقۂ علماء حنفیہ میں اپنے غیر مقلدانہ خیالات اور تفردات کی وجہ سے کچھ زیادہ مقبول نہ تھے، حالانکہ دینی و فقہی معاملات میں اُن کی رائے قرآن و سنت ہی پر مبنی ہوتی تھی۔ اب ایک مدت کے بعد ہمیں قدیم طرز کے مدارس عربیہ اسلامیہ کے دو عالم و فاضل اصحاب کی تحریریں دیکھنے کو ملیں، ایک یتیم پوتے کی وراثت کے خلاف اور دوسری اس کے حق میں۔ ان میں سے پہلی مولانا عبدالرزاق مظاہری کے قلم سے ہے جو مدرسہ مظاہر العلوم (سہارنپور) سے فارغ ہیں اور دوسری مولانا کبیرالدین فوزان کے غور و فکر کا نتیجہ ہے جو دارالعلوم دیوبند کے فاضل ہیں۔ یہ بات معلوم ہے کہ عرصہ ہوا بعض مسلم ممالک میں زیر نظر مسئلہ کا حل ڈھونڈ نکالنے

کے قیام میں بنیادی رول ادا کیا۔ اب انھیں کیسے اسرائیل سے الگ کیا جا سکتا ہے، دوسری طرف یہ بھی ہے کہ "اسرائیلیوں" کو ہزاروں برس پر پھیلی ہوئی یہودیوں کی اُس تاریخ سے بھی جدا نہیں کیا جا سکتا جس میں انھوں نے "غریب الوطنی" کے باوجود اپنے مخصوص جماعتی ادارے قائم کیے اور ان اداروں کے سہارے اپنا مذہبی و تہذیبی تشخص برقرار رکھا۔ اس طرح تحریک صہیونیت جو دوسرے جدید نظریے کا مظہر ہے، یہودی سماج میں ایک نئے تناؤ اور انتشار کا سبب بن گئی ہے اور نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اسلام اور عیسائیت کی طرح یہودیت پر بھی جدید تہذیب کے سیکولر آدرشوں کا اثر پڑا ہے اور ان مذاہب سے وابستہ روایتی سماجوں کو بھی شکست و ریخت کا سامنا ہے۔ شعر و فن سے ہٹ کر اگر تجزیاتی عقل سے جدید تہذیب کا مطالعہ کیا جائے تو ایک اہم بات جو صاف ہو کر سامنے آجائے گی، یہ ہے کہ اس کے نظریۂ کائنات میں سب سے اہم چیز وہ "انسان" ہے جو محض جسم رکھتا ہے، اور چونکہ اس میں "عقلِ محض" یا "قلب" کی کوئی گنجائش نہیں ہے، اس لیے جو کچھ ہے تجزیاتی عقل ہی ہے۔ روایتی سماجوں کو قوت و توانائی اور اطمینان و آسودگی مذاہب سے ملتی ہے جن کا نظریۂ کائنات اُن نورانی تنزلات سے وابستہ ہوتا ہے جو مختلف مدارج سے گذر کر انسان کی روح سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک الگ موضوع ہے کہ شعر و فن بھی جب اس تجزیاتی عقل کی زد میں آتے ہیں تو بے روح بن جاتے ہیں۔

اکتوبر ۱۹۸۳ء

مضمون ضرور پڑھنا چاہیئے۔ یہ مضمون انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (ہمدرد نگر دہلی) کے شعبۂ اسلامی اور تقابلی قانون کے سہ ماہی انگریزی مجلہ Islamic and Comparative Law Quarterly کے جون ۱۹۸۳ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔

تنزیل الرحمٰن صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ بعض مسلم ممالک نے لازمی وصیت کے ذریعہ یتیم پوتے کو دادا کی جائداد و مال میں شریک قرار دیا ہے، لیکن پاکستان کے فیملی لاز آرڈی ننس میں تو اس شرعی حیلے کو بھی نظر انداز کر دیا گیا ہے، آرڈی ننس نمبر ۸ کے سیکشن ۴ کے مطابق "اگر ایک شخص کی وفات ہو جائے اور اس کی وفات کے بعد اس کے ان متوفی بیٹوں بیٹیوں کی اولاد موجود ہو جو اس کی زندگی میں وفات پا چکے تھے تو ایسے بیٹوں اور بیٹیوں کی اولاد ان حصوں کی حقدار ہوگی جو اس کے باپ یا ماں کو ملتے اگر وہ اس شخص کی موت کے وقت زندہ ہوتے۔"

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ "یہ قانون شریعت اسلامی کے مطابق ہے یا نہیں ہے، اس سلسلے میں شروع ہی سے پاکستان میں دو نظریے رہے ہیں۔ اس ملک کی بھاری اکثریت کی بشمول طبقہ علماء (صرف چند علماء کے علاوہ) رائے یہ ہے کہ (آرڈی ننس کا) متعلقہ سیکشن قانون اسلامی کے خلاف ہے، ہاں جدید تعلیم یافتہ افراد کا ایک چھوٹا طبقہ اسے قانون اسلامی کے مطابق تصور کرتا ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ قرآنی احکامات، احادیث نبویؐ، صحابہؓ کے فیصلے اور تواتر کے ساتھ اُمت کا عمل ــــ ان سب سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ فیملی لاز آرڈی ننس کے سیکشن نمبر ۴ سے امت کے اجتماعی نظریے اور موقف کی صریح خلاف ورزی ہوتی ہے۔"

مناسب ہوگا کہ اس سلسلے میں مولوی محمد صاحب کے ایک رسالے کا ذکر بھی کر دیا جائے جو رام پور (یوپی) سے جولائی ۱۹۸۱ء میں آیات محکمات (حصہ سوم) کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس رسالے کا پہلا مضمون "اگر بیٹا نہیں تو پوتا وارث ہوگا" ہم نے غور سے پڑھا۔ افسوس کہ یہ مضمون جذباتیت کی نذر ہو گیا ہے اور دلائل بھی کچھ ایسے وزنی اور قوی نہیں ہیں، لیکن جذباتیت کو نظر انداز کرتے ہوئے، اگر یہ مضمون پڑھا جائے تو جن دو ایک نکات کی طرف مولف نے توجہ دلائی ہے، اُن پر غور کیا جا سکتا ہے۔

کی کوشش کی گئی تھی اور پاکستان میں بھی پاکستان فیملی لاز آرڈی ننس (۱۹۶۱ء) کے ذریعے یتیم پوتے کو وراثت کا حق دلایا گیا ہے، اگرچہ اس آرڈی ننس سے پاکستان کی شرعی عدالتوں کو اتفاق نہیں ہے اور وہاں ابھی یہ مسئلہ زیر بحث ہے۔ ہندوستان میں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبقۂ علماء میں اختلاف رائے ہے۔ بہر حال یہ ایک علمی وفنی مسئلہ ہے اور اس سلسلے میں انھیں لوگوں کی رائے وزن رکھے گی اور معتبر سمجھی جائے گی جو مسئلہ کے تمام دینی وعلمی پہلوؤں پر نظر رکھتے ہوں اور جس پر ایسے حضرات کا اجماع ہو جائے لیکن سوال یہ ہے کہ ہندوستان کے خاص حالات میں اس قسم کا اجماع ممکن بھی ہے؟

پروفیسر طاہر محمود نے اپنی کتاب Family Law Reform in the Muslim World (بمبئی، ۱۹۷۲ء) میں اُن مسلم ممالک کا ذکر کیا ہے جہاں کسی نہ کسی شکل میں لازمی وصیت کا قانون نافذ ہے جس کی رُو سے دادا کے لیے لازمی قرار دیا گیا ہے کہ وہ یتیم پوتے (پوتوں) کے حق میں یہ وصیت کرے کہ اس کی جائداد ومال میں سے اُس کو (اُن کو) اتنا ضرور ملے گا جتنا کہ اس کے (ان کے) باپ کو ملتا اگر وہ زندہ ہوتا۔ سب سے پہلے ۱۹۴۶ء میں مصر میں قانون وصیت کے ذریعہ اس مسئلہ کا حل پیش کیا گیا۔ اس کے بعد شام، ٹیونس، مراکش اور کچھ دوسرے عرب ملکوں میں اسی طرز پر اس مسئلہ کا حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان ملکوں کا خیال ہے کہ ان کی یہ کوشش قرآن کریم کے عین مطابق ہے جیسا کہ حسن بصری، طاؤس، امام ابو محمد ابن حزم الظاہری اور بعض دوسرے فقہاء نے اس سلسلے میں قرآنی تعلیمات کی شرح وتعبیر کی ہے۔ لیکن پاکستان کی اسلامک آئیڈیولوجی کونسل کے صدر، جسٹس تنزیل الرحمن نے اپنے ایک مضمون میں بڑی صراحت سے مذکورہ ملکوں کے قانون وصیت کی متعلقہ دفعہ پر تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ یہ دفعہ سنت رسول ؐ اور صحابہ کرام رضؓ کی فہم وفیصلے کے خلاف ہے اور ائمہ اربعہؒ اور دوسرے فقہاء ومجتہدین کے مسلک کی نفی کرتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ چودہ سو برس سے امت کا اجماع اسی پر ہے کہ قرآن وسنت کی روشنی میں یتیم پوتا محجوب الارث ہے۔ تنزیل الرحمن صاحب کے دلائل علمی اور قوی ہیں اور جو حضرات یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلے سے دلچسپی رکھتے ہوں، انھیں ان کا یہ

کے بعد جو مجتہدین ہوں گے انھیں ائمۂ اربعہ کے جمع کیے ہوئے سرمایۂ احکام و مسائل پر اعتماد کرنا ہوگا۔ ان مجتہدین کا اجتہاد دوسری قسم کا ہوگا اور اسے اجتہاد مقید یا اجتہاد منتسب کہیں گے۔" شاہ صاحب نے اسی بات کو المصفیٰ فی شرح الموطا (جلد ا صفحہ ۱۱) میں زیادہ وضاحت سے بیان فرمایا ہے کہ چونکہ مسائل لامحدود ہیں اور جب تک کہ دنیا ہے یہ پیدا بھی ہوتے رہیں گے، اور کتب فقہ میں جو کچھ ہے وہ ناکافی ہے، اس بنا پر ہر زمانے میں مجتہدین کا ہونا ضروری اور اجتہاد فرض ہے۔ البتہ چونکہ اب کوئی مجتہد ائمہ مجتہدین کی کوششوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اس بنا پر یہ اجتہاد، اجتہاد مستقل نہیں ہوگا جیسا کہ (مثلاً امام شافعیؒ کا تھا"۔

اس سلسلے میں شاہ صاحبؒ نے ایک بڑی اہم بات کہی ہے جسے ہر ایک مجتہد منتسب کو (اگر اس زمانے میں یا آیندہ زمانے میں کوئی پیدا ہو) اپنے سامنے رکھنا ہوگا۔ مولانا اکبر آبادی نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے" حضرت شاہ صاحب کی رائے ہرگز یہ نہیں ہے کہ ائمہ اربعہ سے کتب فقہ میں جو کچھ منقول ہے اس پر تنقید کرنا یا اس سے انحراف یا اختلاف کرنا جائز نہیں ہے۔ ائمہ کے خود باہمی اختلافات اور ان کے تلامذہ کا ان سے اختلاف خود اس بات کی دلیل ہے کہ اگر ہمارے پاس قرآن وسنت سے دلائل قوی ہوں تو ہم بھی ائمہ کی رائے سے اختلاف کر سکتے ہیں، چنانچہ شاہ صاحب تفہیمات الٰہیہ (جلد ا، ص ۲۱۲-۲۱۱) میں فرماتے ہیں: " ملاء اعلیٰ کی طرف سے میرے دل میں ایک داعیہ پیدا ہوا، اور وہ یہ کہ امام ابوحنیفہ اور امام شافعی کے پیرو امت مرحومہ میں اور ان کی تصنیفات بہت زیادہ ہیں۔ ملاء اعلیٰ کے علوم کے منشا کے مطابق حق یہ ہے کہ ان دونوں کو ایک مذہب تصور کیا جائے، پھر ان دونوں کو حدیث کی مدونہ کتب میں تلاش کیا جائے۔ پس اگر یہ دونوں مذہب اس کے مطابق ٹھہریں تو انھیں قبول کر لیا جائے اور اگر ان کی اصل کا پتہ نہ چلے تو انھیں چھوڑ دیا جائے۔"

مرحوم مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی ہمارے اس دور کے ان علماء میں سے تھے جو دین اسلام اور شریعت اسلامی کے مزاج شناس رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر کا اقتباس اس انداز میں دیا ہے کہ گویا وہ مولانا آزاد کی رائے سے متفق ہیں۔ مولانا ندوی نے لکھا ہے کہ جب مصطفیٰ کمال نے ترکی میں خلافت کے ساتھ اسلامی

عرصہ ہوا ہم نے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا ایک مضمون بعنوان "شاہ ولی اللہ کا نظریۂ اجتہاد" پڑھا تھا جو "فکر اسلامی کی تشکیل جدید" (ناشر: ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، جولائی ۱۹۷۶ء، صفحات ۲۹۰ - ۲۸۱) میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون کے چند ٹکڑے درج ذیل ہیں:

"ایک معمولی سوال ہے، اور وہ یہ کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی آخر الزماں ہیں اور قرآن آخری کتاب الٰہی ہے تو پھر زمانے کی ترقی کے ساتھ تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت کے جو نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہیں گے، ان کا حل کس طرح ہوگا۔ جس طرح یہ سوال سادہ ہے اسی طرح اس کا جواب بھی سادہ اور بے تکلف ہے، اور وہ یہ کہ اجتہاد کے ذریعے۔

"حضرت شاہ ولی اللہ جنھوں نے شریعت کے ایک ایک جز اور اس کے ایک ایک سرّ خفی و جلی کا جائزہ کمال ژرف نگاہی و روشن دماغی سے لیا ہے، وہ شریعت اسلام کے اس پہلو سے پہلو تہی کس طرح کر سکتے تھے۔ ان پر یہ حقیقت مخفی نہیں رہ سکتی تھی کہ قرآن مجید کی آیت 'الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی' کے مطابق دین جو اصول و کلیات کا مجموعہ ہے، اس کو مکمل اور کامل قرار دیا گیا ہے لیکن شریعت جو قوانین و ضوابط کا مجموعہ ہے، اس کو کامل نہیں فرمایا گیا۔ چونکہ زمانہ برابر رواں دواں ہے، انسانی تہذیب و تمدن ترقی پذیر ہیں، اس بنا پر جدید معاملات و مسائل کے لئے قرآن و سنت، تعامل صحابہؓ، اجماع امت اور فقہی نظائر و شواہد کی روشنی میں استنباط و استخراج احکام کا سلسلہ برابر جاری رہے گا اور اس طرح شریعت کے ذخیرے میں نشو و نما اور اضافہ ہوتا رہے گا۔۔۔"

مولانا اکبر آبادی لکھتے ہیں کہ "شاہ صاحب نے اجتہاد کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک اجتہاد مستقل اور دوسرا اجتہاد منتسب۔ انھیں دو قسموں کو انھوں نے بعض جگہ اجتہاد مطلق اور مقید کے لفظوں سے بھی تعبیر کیا ہے۔" شاہ صاحب کے نزدیک ائمہ اربعہ مجتہدین مستقل تھے اور ان کے بعد اس اجتہاد مستقل یا مطلق کا انقطاع ہو گیا۔ ان

نہ ہو۔ دراصل بات یہی ہے مگر علم کی کمی، فہم کے قصور، زمانے کے تقاضوں سے ناواقفیت، جرأت کے فقدان اور قدامت پسندی کی بنا پر کسی نئے رخ پر قدم بڑھانے کی ہمت نہیں ہوتی ہے اور جب کوئی نیا مسئلہ سامنے آتا ہے تو اس کے حل کے لئے علماء فقہ و فتاویٰ کی پرانی کتابوں کی طرف رجوع ہوتے ہیں، حالانکہ جن مصنفین نے یہ کتابیں لکھی ہیں ان کے سامنے نہ تو یہ جدید حالات تھے نہ وہ موجودہ تقاضوں سے باخبر تھے۔ ان لوگوں نے اپنے دور کے مسائل پر غور کیا اور جو مشکلات ان کے سامنے پیش آئیں کتاب و سنت کی روشنی میں انھیں حل کرنے کی کوشش کی اور زمانے کی رفتار، لوگوں کی ضروریات کا اندازہ کر کے کچھ آیندہ رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں کلی مشورے دیئے، لیکن انسانی دوربینی اور قیاس آرائی کی ایک حد ہوتی ہے۔ کوئی کیسا ہی بصیر اور کتنا ہی صاحب فکر و نظر ہو وہ صدہا برس آگے کے حالات کا پورا اندازہ نہیں کر سکتا ہے۔ دور دراز مستقبل کو بے حجاب دیکھنا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ وہ صرف ماضی کے واقعات اور حال کے تجربوں ہی سے مستقبل کو قیاس کر سکتا ہے۔ اس قیاس میں قدم قدم پر غلطیوں کا صرف امکان ہی نہیں بلکہ وقوع ہوتا رہتا ہے، (اور) اس کا تجربہ ہم سب کو ہے۔"

ہم جانتے ہیں کہ ائمہ اربعہؒ میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ ہمارے اقوال یا ہماری رایوں کی پابندی ضروری ہے اور اس سے ان کا منشا یہی ہوگا کہ لوگوں کو اپنا ذہن کھلا رکھنا چاہیئے اور ہمہ وقت ان کی نظر اس پر رہنی چاہیئے کہ معاملات دنیوی میں وہی اصول معقول، قابل قبول اور بربنائے انصاف سمجھا جائے گا جس سے لوگوں کو نفع پہونچے، یعنی نفع دینے والی چیزیں مباح، نقصان پہونچانے والی ممنوع ہوں گی۔ شریعت کا بھی یہی مقصد ہے، چنانچہ ابن قیمؒ کی یہ بات بڑی متوازن اور صحیح ہے کہ "شریعت کی بنیاد حکمتوں اور لوگوں کی دنیوی اور اخروی فلاح و بہبود پر ہے اور شرع کل کی کل انصاف ہے، سراسر رحمت اور حکمت ہے، پس جس مسئلے میں انصاف کے بجائے ظلم ہو، رحمت کے بجائے زحمت ہو، فائدے کے بجائے نقصان ہو اور عقل کے بجائے بے عقلی ہو، وہ شریعت کا مسئلہ نہیں، اگرچہ اسے بذریعہ تاویل شرع میں داخل کر لیا گیا ہو۔"

معاشرۂ انسانی، قانون اور اخلاقی اقدار میں ایک ایسا محکم رشتہ ہے جسے بدلتے ہوئے حالات میں ہمیشہ تلاش اور مستحکم کرتے رہنا چاہیئے، اسی تلاش کا اصطلاحی نام اجتہاد ہے۔ لیکن دین اسلام اور

قوانین کو بھی منسوخ قرار دے دیا تو اس کے خلاف دنیائے اسلام میں شدید ردعمل ہوا اگر بقول مولانا ابوالکلام آزاد:

" یہ اس عقیم نصاب تعلیم کا نتیجہ تھا جس نے لئے انداز کو نظر انداز کیا اور ان علماء کا قصور تھا جو ہنوز افلاطون وارسطو کے در کی جاروب کشی میں مصروف ہیں۔ دنیا بدل گئی ہے علوم و فنون کہاں سے کہاں پہونچ گئے ہیں، فکر و نظر کا معیار کچھ سے کچھ ہو گیا ہے، ذہنوں کے سانچے یکسر بدل گئے ہیں لیکن ہمارے علماء ہنوز یونانیوں کے پس خوردہ پر قناعت کئے ہوئے ہیں۔ وہ عصر حاضر کے مسائل فرسودہ کتابوں سے حل کرنا چاہتے ہیں اور نئے سوالات کے جواب پرانی کتابوں میں تلاش کر رہے ہیں۔ اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ ہم کسی کو برا بھلا کہیں اور بڑھتی ہوئی لادینیت پر صف ماتم بچھائیں بلکہ اصل خرابی کو سمجھیں، زمانے کے تقاضوں سے آشنا ہوں، نئے انداز نظر سے واقفیت حاصل کریں، جدید علوم و فنون کو نصاب میں شامل کریں، مذہب کے اصل سرچشموں تک رسائی حاصل کریں، تقلید جامد کے شیوۂ قدیم کو ترک کردیں، کتاب وسنت کے اصل نصوص کو غور و فکر کا مرکز بنائیں، نظر میں وسعت اور فکر میں گہرائی پیدا کریں، خود ساختہ رسم ورواج کی بندشوں سے آزاد ہوں۔ اگر ہم نے ایسا کر لیا تو عصر حاضرہ کی مشکلات کو حل کرسکیں گے ورنہ ہماری کہنہ دیواروں میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وقت کے اس تند و تیز دھارے کو روک سکیں "

اس کے بعد مولانا عبدالسلام قدوائی لکھتے ہیں: "مسلمان اسلام کو خدا کا آخری دین، قرآن مجید کو آخری کتاب اور اپنے پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو آخری پیغمبر سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں اسلامی شریعت کو کس طرح جامد سمجھا جا سکتا ہے۔ جب قیامت تک قرآن مجید زندگی کا دستور العمل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت معیار عمل ہے تو ان کے اندر قدرتاً ایسی لچک ہونی چاہیے کہ اس تغیر پذیر دنیا میں اسلامی احکام پر عمل میں کوئی دشواری محسوس

شریعت اسلامی کے جو کھٹے میں اس تلاش اور جہد مسلسل یعنی اجتہاد کے لئے چند شرائط ہیں ان شرائط کو جو شخص یا اشخاص کی جو انجمن پوری کرتی ہو وہی اس کی اہل ہو سکتی ہے۔ ہر کس و ناکس کو نہ تو اس کی ہمت کرنی چاہیئے اور نہ اس کی اجازت ہونی چاہیئے۔ یہ شرائط یا مجتہدین میں کیا کیا صلاحیتیں ہونی چاہئیں متعلقہ کتابوں میں مذکور ہیں اور شاہ ولی اللہؒ نے بھی اپنے رسالے عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید میں اس موضوع پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ شرطیں اگر کسی ایک شخص میں نہ پائی جائیں تو پھر کوئی ایسی انجمن یا مجلس ہو جس میں ان صلاحیتوں میں سے الگ الگ صلاحیت کے افراد مل کر ایک ایسی اجتماعی شخصیت بن جائیں کہ بقول شاہ صاحب مسلمان اجتہاد کا فرضِ کفایہ ادا کرتے رہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک عرصہ سے مسلمانوں نے اس فرض کو ترک کر رکھا ہے۔ ایسی صورت میں کیا ہم سب عنداللہ گنہگار نہیں ہیں؟ یقیناً ہم بڑی غفلت میں پڑے ہوئے ہیں اور زمانہ ہے کہ اس کی رفتار تیز ہے، حالات تیزی سے بدل رہے ہیں اور ہماری غفلت کی وجہ سے مسلم معاشرہ میں کئی اخلاقی خرابیاں در آگئی ہیں، یہی صورت حال رہی تو مزید خرابیاں پیدا ہوں گی اور ہم کفِ افسوس مل کر رہ جائیں گے۔ جنوری سنہ ۱۹۸۴ء